روزنامہ صبح دکن

خود مختاری دکن نمبر

سلطنت آصفیہ کے دو صد سالہ قیام خود مختاری کی یادگار میں

ایڈیٹر

احمد عارف

قیمت ۔۵/

فہرست مضامین

افتتاحیہ

ہمارا یہ نمبر جو خود مختاری کی یادگار میں پیش ہو رہا ہے اس کا مقصد اس یاد کو تازہ رکھنا ہے جس کی وجہ سے ہماری ریاست ابد پائیدار بفضلہ زندہ اور روبہ ترقی ہے ہندوستان کی اصلی آزادی اور حقیقی ہندوستانی حکومت کا خاتمہ مغلوں کے ساتھ ہو گیا۔ اب لے دیکر یہ تنہا یادگار ہندو مسلم طرز حکومت کی رہ گئی ہے۔ اس دور اندیش مدبر کی یاد کو کبھی کوئی صاحب احساس بھلا نہیں سکتا جس کی بے نفس کوشش اور برمحل خودداری نے دکن کے اس خطہ کو تباہی اور بربادی سے بچا لیا۔

خاندان آصف جاہی کی حقیقی عظمت اس وقت سے ہوتی ہے جبکہ حضرت آصف جاہ اول نے مرکزی حکومت دہلی سے الگ ہو کر دکن کو آزاد اور خود مختار دولت کی شکل میں بدل دیا۔ جو لوگ ہندوستان کی تاریخ آزادی کا گہرا مطالعہ کر چکے ہیں انہیں یہ معلوم ہے کہ ہر ایسے موقع پر جبکہ ہندوستان بیرونی قوتوں کا شکار بن کر اپنی تہذیب و تمدن کو فاتح اقوام کے حوالے کر رہا تھا اس وقت اس کو بچانے اور پرانی روایات اور اداروں کو محفوظ رکھنے کی خدمت دکن نے انجام دی۔ اور [illegible] یہ سعادت [illegible] حکومت کو نصیب ہوئی۔ پٹھانوں کے دور میں بانی سلطنت بہمنی نے دکن کو دہلی کی کمزور مرکزیت سے الگ کر کے ہندوستانی کلچر کی پناہ گاہ بنا لیا اور دور مغلیہ کی تباہی کے بعد آصفی تدبر نے ہندوستان کی اس امانت کو دکن کے سپرد کیا جس کو وہ اب تک پوری دیانت داری سے سرانجام دے رہا ہے۔

کسی ملک کی قدیم روایات کا تحفظ اور ان کے احیاء کی اہمیت وہی لوگ اچھی طرح سے سمجھ سکتے ہیں جنہیں زندہ قوموں کی بڑائی اور طاقت کا راز معلوم ہے۔

آج تمام ہندوستانیوں کی توقع اور امید بھری نظریں صرف دکن اور دولت آصفیہ ہی پر پڑتی ہیں۔ ہندو اور ہندو مسلم تہذیب کا گہوارہ یہی سرزمین ہے اور یہیں سے آئندہ ہندوستان کی آزادی اور خودداری کے درس مل سکتے ہیں۔ یہ بات عام طور پر سمجھ میں نہیں آ سکتی کہ دکن نے آخر ہندوستان کی تہذیب و تمدن کو محفوظ رکھنے میں کیا خدمات انجام دیں لیکن ذرا سے غور کے بعد اس چیز کے مختلف پہلو ایک ایک کر کے سامنے آ سکتے ہیں۔ سب سے پہلی وہ تہذیب تو دکن کے خزانہ علم آثار میں موجود نظر آتی ہے جس کی شان و شوکت کے جلوے ہم کو ایلورا اور اجنٹا کے پہاڑوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ خود رام چندرجی کی صدا قت اور راون پر فتح اہل دکن کی امداد سے ہوتی ہے۔ پانڈو اور [illegible] ظالم حکمرانوں کے مقابلہ کی تو ایلورہ کے میدانوں میں پناہ حاصل کرتے ہیں اور تاریخی عہد میں وسط ایشیا اور یونانی طاقتوں کی دست برد سے بچانے کیلئے یہی مقام جائے پناہ کا کام دیتا ہے۔ ایلورہ اور اجنٹہ کے غار اور خالص ہندو تہذیب کے مرکز دیوگر دھی اور ورنگل وغیرہ ہندو تہذیب کے ہر کارآمد جزو کو سیل فنا سے بچاتے ہیں۔

بہمنی دہلی کے انتشار سے الگ ہو کر اس تہذیب کو دکن میں فروغ دینے میں جن کے بنانے اور سنوارنے میں اہل ہند کا دماغ مہارت اور محنت صرف ہوئی ہے۔ اور بعد میں جبکہ دکن کی چار مسلم ریاستیں اور ایک ہندو ریاست اس خدمت کو بجا لاتی ہے اور علوم و معارف کے جس بہا خزانے ہماری تمدن کے اعلیٰ نمونے جن پر دنیا کی کوئی قوم بجا طور پر فخر کر سکتی ہے بطور یادگار کے چھوڑ جاتی ہے۔

یوں تو مغلوں کو ابتدا ہی سے دکن کو اپنی عملداری میں شامل کر کے تمام ہندوستان کو ایک حکومت کے شیرازہ میں منسلک کر دینے کا خیال دامنگیر تھا لیکن اس زبردست کام کے لئے عالمگیر اولوالعزم مدبر کی ضرورت تھی اورنگ زیب کے بعد کوئی صاحب دماغ اس شاندار تیموری خاندان میں باقی نہ تھا جو اپنے آبا و اجداد کے اس کارنامہ کو زندہ و برقرار رکھ سکتا اور خوف تھا کہ بجائے اپنی میراث کو محفوظ رکھنے کے وہ اپنی نااہلی اور سہل انگاری سے اسکو برباد کر بیٹھیں کہ ایسے میں ایک صاحب دماغ عالمگیری دور کے تربیت یافتہ بزرگ اٹھتے ہیں اور جب تمام ہندوستان کو محفوظ کرنا ان کے بس سے باہر نظر آتا ہے تو صرف دکن کو جو ہمیشہ سے اسی کار عظیم میں سرخرو کے قابل ثابت ہوا اپنے تخیل کا مرکز بنا لیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب دولت آصفیہ ہی وہ مقام ہے جہاں قدیم ہندو تمدن سے لیکر متوسط زمانہ تک کی تہذیب و معاشرت کے آثار باقی ہیں اور جہاں ہندوستانیوں کی اس عام جد و جہد کے نقش قدم پائے جاتے ہیں۔ جو عام انسانیت کی ترقی میں صرف ہوئی۔

ہم اپنی خوش نصیبی پر ناز کرتے ہیں کہ اس پیر میکدہ کی یاد ہم اس عہد میں منا رہے ہیں جبکہ اس کے روشن دماغ جانشین اعلیحضرت بندگانعالی خلد اللہ ملکہ نے اپنی شاہانہ اولوالعزمیوں سے نہ صرف ان روایات کو محفوظ رکھا بلکہ ان میں ایک نئی روح پھونکدی۔ زندہ باد دولت آصفیہ و زندہ باد آصف جاہ سابع۔

ایڈیٹر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قیام سلطنت آصفیہ

از جناب محمد حبیب اللہ صاحب رشدی ایم۔ اے عثمانیہ

طوفاں مچا ہوا تھا دنیائے ہند میں جب
گلشن کے ہر شجر پر آفت ہوئی تھی نازل
مغرب کے باد و باراں یلغار کر رہے تھے
سارا چمن ہمارا وقفِ خزاں ہوا تھا
اک پیر مرد غازی سنکر صدا خزاں کی
اٹھا اور اس نے اٹھکر دیکھا فلک کی جانب
دُور فلک میں دیکھی تصویر عہد نو کی

مالی تھا وہ چمن کا، تھی اس کے دم سے رونق
دیکھی خزاں جو اس نے پیارے وطن کو چھوڑا
چھوٹی سی ناؤ لیکر نکلا وہ نوح ثانی
اور دور جاکے اس نے ڈھونڈھا نیا جزیرہ
ڈوبا جہاز جس دم ملاح سارے ڈوبے
غوطے بہت سے کھائے واں جا بسے بہت سے
رحمت خدا کی تجھ پر اے پیر مرد غازی!

اے دکن اے کہ جہاں را سر سودا باتست

از جناب مولانا عبداللہ عمادی ناظر مذہبی دار الترجمہ

(۱)

دکن کا اصلی نام جو کچھ ہو لیکن یہ نام تو اس وقت پڑا ہے جب عرب کے عالمگیر تمدن نے اس ملک کی خوش سلیقہ ترتیب و تنضید کی قدرشناسی کی مورخ محبّی اپنی شہرۂ آفاق عربی تالیف (خلاصۃ الاثر) کی تیسری جلد میں یہاں کے ماثر و مکارم کا مزہ لے لیکے تذکرہ کرتا ہے اور حسن معاشرت کے ایسے لطیف نمونے دکھاتا ہے جن کے مناظر کسی کامل و مکمل شائستگی ہی میں دیکھے جاسکتے ہیں وہی دکن اب بھی ہے مگر اس کے وہ خصایص اب کہاں؟

جس آب و ہوا کو آج ضعیف و مرطوب و بے طاقت کہا جاتا ہے، اسی آب و ہوا کی دولت نے کل تک معرکۂ سیاست میں "رن دولہ" کی پرورش کی تھی، خط استوا کے منطقہ سے ایک شخص یہاں آتا ہے اور اسی آب و ہوا کے فیض تربیت سے "خداوند خاں" بن جاتا ہے جس کے بنائے ہوئے ایک قلعہ کا کتابہ بیستطاق بوز کے مقابلہ میں آج بھی اپنی مقاومت کا ثبوت پیش کرنے کو ہے کہ ۔

سدّ بود بر سینۂ دجال فرنگی این بنائے

وہ آب و ہوا جس نے افریقہ کے ایک بے حقیقت غلام کو "ملک عنبر" بنایا تھا اور اسی پادشاہ نشان غلام سے ہندوستان کی مجموعی لشکر کشی کا کامیاب مدافعہ کرایا تھا اب بھی تو اسی آب و ہوا کے پروردہ ہیں، اس عزم بلند کے خط و خال کچھ تو نمودار ہوں اس آتش خاموش کی بھوبل میں کچھ تو حدت و حرارت محسوس ہو کس کام کی وہ ہستی جس میں زندگی کے آثار نہ ہوں، کیا فائدہ اس دست دراز سے جس کا حوصلہ کوتاہی کرے ۔

(۲)

دکن کردہ اپنی فوج کشی آج تک یاد ہے ۔ جو اس نے فرانسیسیوں کی تعدی و تسلط ول کا انتقام لینے کیلئے ۱۱۶۳ھ میں کی تھی ایک طرف یورپ کا آتش افروز سامان حرب حرابہ بنز دکھا دوسری طرف سرکار آصف جاہی کا ایک تیر مرد تھا، ادھر سے برق اندازان دکن آتش بار تھے ادھر سے اسلحہ پیرس اپنی آگ برسانے کی محویت میں فی النار تھے آخر تمدن یورپ کا جدید ترین ساز و برگ اسی عزم و استقلال دکن کے سامنے بے ساز و برگ ہو گیا، عفریت فرنگ کی بدخواہی پر اسم اعظم آصفجاہی غالب آیا، شادیانۂ فتح بلند آواز ہوا اور باد جنوب اس ترانۂ نصرت کو اکناف شمال تک لے گئی کہ :-

دمید کوکب مسعود اوج دولت ما ۔ نواختند بریں نہ رواق نوبت ما

عدو بحضرت ما دست بستہ حاضر شد ۔ کہ طاقت بازوی و از ہیبت ما

گریخت فوج نصاریٰ ز صولت احمد ۔ نمود شاد فرنگ انقیاد حضرت ما

سپاہ فتح و ظفر پیش پیش می آید ۔ بہر طرف کہ خرامد خجستہ رایت ما

ز آتش غضب ما بسوخت فوج فرنگ ۔ سزای آں کہ شتابد بسر ز ارادت ما

ازیں ظفر کہ بتائید غیب جلوہ نمود ۔ رسیدہ است بآفاق صیت شوکت ما

ہمیشہ ہست ظفر در رکاب ما ناصر
کہ ہست فضل الٰہی معین ہمت ما

یہ ترانۂ نصرت نواب میر احمد خاں بہادر ناصر جنگ کا طبع زاد ہے جو نواب مغفرت مآب حضرت آصفجاہ اول کے فرزند جانشین تھے اور جنھوں نے علاقہ ارکاٹ میں فرانسیسیوں کو شکست دی تھی تاریخ نے اس ترانہ کو محفوظ رکھا ہے اور دکن کا ملکی ترانہ قرار دیا ہے ۔

بساط جنگ الٹ چکی ہے دکن کا مقابلہ اب یورپ سے ہے نہ اہل یورپ سے لیکن محل عبرت یہ ہے کہ جو ملک اپنی ایسی تابناک تاریخ رکھتا ہو وہ یورپ زدگی کے سیلاب عشرت میں غرق کیوں ہو جائے آپ کا اپنا ایک تمدن ہے ایک معاشرت ہے ایک حکومت ہے اور اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک خاص مذہب بھی ہے کیا آپ کو ان سب کا غارت جانا محض اس لئے گوارا ہے کہ یورپ کہ یہ ہمرنگ نہیں؟ حیف ہے اگر حوض کوثر سے فیضیاب ہونے والے واٹر ورکس کی آرزو کریں اور تہہ آب ثاقب پر دسترس رکھنے والے گریگ فایر کے درپے ہیں ۔

(۳)

آپ اپنے کو دیکھئے اور پھر ہندوستان کی عام حالت پر نظر کیجئے آپ کو ایسی نعمت عظمی حاصل ہے جس سے ہندوستان یک لخت محروم ہے آپ کی اپنی حکومت ہے اپنی ملکی سلطنت ہے آپ ہی کا قانون آپ پر کارفرما ہے آپ ہی کی زبان (اردو جو دکن ہی میں پیدا ہوئی اور یہاں سے باہر پھیلی) آپ کی تعلیم و انصاف کی مشکل کشائی اپنی حکومت کی تقویت میں کوشش کیجئے جو آپ ہی کیلئے موجب تقویت ہے

اپنے ملک و ملت کو حقیر و بے توقیر نہ سمجھئے کہ اس میں آپ ہی کی حقارت ہے۔ بیرونی اثر پر اپنے مذہب و تہذیب کی بھینٹ نہ چڑھایئے کہ اس میں آپ ہی کی ذلت ہے اپنے بادشاہ کی طاقت و عظمت بڑھانے والے بنئے کہ یہ عین آپ ہی کی طاقت و عظمت ہے اور اسی میں آپ کی فلاح وبہبود و عزت ہے۔

سبز بادا سرت اے سرو سہی — کہ ترا تازہ بہاراں بکند
شجر دیں کہ مطرامسا ناد — مثمرش فرۂ فاراں بکند
نخل جاوید بہار توحید — خرمش دولت قراں بکند

باش تا خامہ ظلمت شب — جلوۂ مہر درخشاں بکند
پرتو صبح سعادت روشن — سایۂ رحمت یزداں بکند
آصف عہد سلیماں آثار — زندہ دین نبوی ہاں بکند

یعنے احیائے شعار اسلام
میر عثمان علی خاں بکند

پیغام

از مولانا سید شاہ ابراہیم عفو مرحوم

نصیب کس کو خدا جانے کامرانی ہے
قدیم طرز عمل اور ہزار مشکل ہے
غرض زمانہ کے ہاتھوں سے ہم ہوئے برباد
مگر جہان کی ہے شان انقلاب یہی
حیا جو تم میں ہے باقی نہ روؤ اور نہ رلاؤ
چلو چلو کہ ہر اک قافلہ روانہ ہے

خمار عیش گذشتہ گر کہانی ہے
کہ صبح و شام چمن میں فغان کوئل ہے
گرے کچھ ایسے نہ اٹھے کبھی زہے افتاد
یہی ستاروں کی گردش ہے آفتاب یہی
یہ جتنا کہتے ہو بس اس کا نصف کرکے دکھاؤ
اٹھو اٹھو کہ خدا کو بھی منہ دکھانا ہے

بیا کہ روئے بہ محرابگاہ نور نہیم
بنائے کعبۂ دیگر ز سنگ طور نہیم

استقلال

از مولوی قاضی تلمذ حسین صاحب ایم اے رکن دار الترجمہ

لفظ "استقلال" اگرچہ بذیل التعاقات سلطنت قدیم سے استعمال ہوتا رہا ہے مگر ادہر چند برسوں سے جس معنی مخصوص کے ساتھ اسکا استعمال شروع ہوا ہے اسے بالکل حادث و جدید کہنا چاہیے۔ قدیم ادب میں یہ لفظ ایسے مواقع پر استعمال ہوا ہے جہاں یہ ظاہر کرنا مقصود ہو کہ کسی شخص نے بلا شرکت غیرے سلطنت کی یا کسی ایسے شخص نے سلطنت پر بالاستحکام قبضہ کر لیا جسے قانوناً اس کا استحقاق نہ تھا لیکن اب جدید مفہوم میں اس لفظ کا اطلاق خود سلطنت پر ہوتا ہے یعنی سلطنت کسی دوسرے کی طبعیت سے آزاد اور اپنی جگہ پر خود مختار ہو۔

مصر میں اس لفظ نے اولاً یہ نیا مفہوم پیدا کیا اور وہیں سے اس کی اشاعت ہوی لیکن نظر غور سے دیکھا جائے تو لفظ کے مفہوم میں تغیر نہیں ہوا ہے بلکہ خود سلطنت کے مفہوم میں تغیر ہو گیا ہے ایک زمانہ تھا کہ "سلطان" اور "ذو سلطان" دو بیگانہ سے نہیں تھے بلکہ جملہ "سلطان" ذو سلطان کی ذات میں شامل تھا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ ذو سلطان کو سلطان کہنے لگی فرانس کا وہ صاحب شان و شکوہ فرمانروا لوئی چہاردہم جس پر یورپ کی شوکت شاہی کا آغاز و انجام ہو گیا نہ اس کے قبل اس شان کا کوئی بادشاہ یورپ میں ہوا نہ اس کے بعد، وہ کہا کرتا تھا کہ "میں ہی سلطنت ہوں"

تاج و اکلیل سلاطین در دو عالم بشکنے
با قبا و قند زر و بالش و قربان سنم۔

لیکن اب اس زمانہ جدید میں "سلطان" اور "ذو سلطان" یا سلطنت اور صاحب سلطنت میں تفرقہ پڑ گیا ہے۔ اب قہرمانی سلطان مالک رقاب امم کے ہاتھ سے نکلکر عامۃ الناس بلکہ عوام کالانعام یا بد ترازیں نیز غوغائیوں کے ہاتھ میں آ گئی ہے۔

گرد ناگہ عجز سلطان قہر غوغا آشکار
قہر غوغائی ببین و عجز سلطانی نگر۔

اب وصف "استقلال" خود سلطنت کی کی ذات کے ساتھ وابستہ ہے رسمی صاحب سلطنت با استقلال ہو یا نہ ہو بلکہ واقعتاً و حقیقتاً نہیں ہوتا ہے اور اس سے بڑہکر یہ کہ نفس سلطنت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ استقلال سلطنت کے شروط و قیود کیا ہیں؟ اس کے لئے اولاً خود سلطنت کے لزوم و شروط کا معلوم ہونا ضروری ہے سیاسی فلسفیوں نے اس معشوقۂ جہاں و فتنۂ دوراں کے خد و خال کی تعریف و توصیف میں شعرائے عاشق مزاج اور عشاق نازک خیال کے بہ نسبت کچھ کم موشگافیاں نہیں کی ہیں لیکن اسے مانتے ہوے کہ۔

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست
بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

اتفاق عام اسپر ہو گیا ہے کہ چار اوصاف لازمی ہیں (۱) مملکت (۲) آبادی (۳) وحدت (۴) تنظیم۔

مملکت یعنی ایک خاص قطعہ ارض اور آبادی یعنی اشخاص مشمول سلطنت کا ہونا تو ایسی بدیہی شرطیں ہیں کہ ان کے بغیر سلطنت کا تصور کبھی ذہن میں نہیں آسکتا مگر غور طلب مسئلہ وحدت اور تنظیم کا ہے اور پھر تنظیم ہی کا نتیجہ حاصلہ استقلال و عدم استقلال کا معیار ہے مملکت اور آبادی اگرچہ شروط اولیں ہیں مگر ان کی حدود وسعت نہایت درجہ غیر متعین ہے مملکت کا رقبہ ایک میل کا بھی ہو سکتا ہے اور دس لاکھ میل کا بھی ہو سکتا ہے آبادی ایک سو بیس[1] نفوس پر بھی مشتمل ہو سکتی ہے اور چالیس کرور پر بھی محتوی ہو سکتی ہے مگر وحدت میں کمی بیشی کو دخل نہیں ہے بلا لحاظ ضیق و وسعت مملکت اور قلت و کثرت آبادی۔

وحدت کا کامل و اتم ہونا لازمی ہے اگر وحدت میں ادنیٰ خلل بھی ہوگا تو سلطنت مختل ہو جائے گی "وحدت" سے مقصود یہ ہے کہ کل جسم سلطنت اپنے عمل میں متحد و متفق ہو یعنی اس جسم سلطنت سے متضاد و متنافر اعمال نہ صادر ہوتے ہوں اگر ایسا ہوگا تو سلطنت ایک نہیں رہے گی

---

[1] یہ تعداد ان آبائے زائرین کی ہے جنہوں نے انگلستان سے ہجرت کر کے امریکہ میں جاکر اولاً انگریزی سلطنت قائم کی۔

بلکہ جس تعداد میں غیر مبنی بر یکدگر اعمال صادر ہوسکتے ہوں وہی تعداد سلطنت کی قرار پا جائیگی اس وحدت کی ہیئت ظاہری یا ترتیب عملی کا نام "تنظیم" ہے اور سلطنت کے استقلال و عدم استقلال کا مدار تمام تر اس تنظیم پر ہے۔ یہ تنظیم دو اجزا پر مشتمل ہے "حاکم" و "محکوم"، ان دونوں اجزا کا ہر سلطنت میں ہونا لازمی و لابدی ہے سلطنت شخصی ہو یا عمومی شخصی سلطنت میں تو یہ فرق صاف طور پر بین و ظاہر ہے مگر عمومی سلطنت میں مغالطہ کا احتمال پیدا ہوسکتا ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب قوم خود حکمراں ہے تو محکوم کون ہے؟ لیکن اس کی حقیقت مغالطہ سے زیادہ نہیں ہے وہ حاکم ہی محکوم ہے ؎

"جملہ شاہان پست پست خویش را
جملہ خلقان مست مست خویش را
جملہ شاہان بردۂ بردہ خودند
جملہ خلقاں مردہ مردہ خود اند"

اس رمز صوفیانہ کی تعبیر سیاسیہ یہ ہے کہ عمومی حکومت میں اگر نمائندگی کا طریق جاری ہے تو اس صورت میں تو ایک حکمراں جماعت صاف طور پر عام قوم سے ممیز ہو جاتی ہے لیکن اگر نمائندگی کا طریق نہ بھی جاری ہو اور ہر فرد قوم جمعیت قومی میں شامل ہو کر حکمرانی میں شرکت کا مجاز ہے تو بھی حاکم و محکوم میں فرق ہوگا جمعیت من حیث المجموع حکمراں ہوگی اور قوم من حیث الافراد محکوم ہوگی یہیں سے "استقلال" کا نازک نکتہ نکلتا ہے اس حکمراں قوت کے اقتدار پر "استقلال" کی عمارت بپا ہوتی ہے "مملکت" آبادی وحدت تنظیم ایسے شرائط ہیں جو ذی استقلال اور غیر استقلال دونوں انواع سلطنت[1] میں قدر مشترک ہیں ذی استقلال سلطنت کا مابہ الامتیاز اس کی حکمراں قوت کا درجہ اقتدار ہے اگر یہ درجہ "اقتدار مطلق" کی حد کو پہنچا ہوا ہے یعنے سلطنت اپنے اقتدار کے نفاذ میں کسی دوسری سلطنت کے زیر اثر نہیں ہے، تو وہ ذی استقلال سلطنت ہے۔

بہت پیچیدہ مسئلہ تو اس اقتدار کے کسی دوسرے کے زیر اثر ہونے نہ ہونے کا ہے۔ اس زیر اثر ہونے کی دو جہتیں ہیں۔ داخلی و خارجی ممکن ہے اور نہ صرف ممکن ہے بلکہ واقعاً ایسا ہوا ہے اور ہوتا ہے کہ سلطنت کا جزو حکمراں کسی جزو غیر حکمراں کے زیر اثر رہے اس کا امکان عمومی سلطنت میں ویسا ہی ہے جیسا شخصی سلطنت میں فرمانروا کا کسی غیر فرمانروا قوت کے زیر اثر ہو جانا تو ایک معمولی امر ہے مثلاً جہانگیر کی حکمرانی درپردہ نورجہاں کی حکمرانی تھی مگر عمومی سلطنت میں ایسا ہوتا رہتا ہے حکمراں جماعت (یعنی جماعت وزرا و عمال) کا طبقہ رائے دہندگان کے زیر اثر ہوتا تو ایک کھلی ہوئی بات ہے لیکن اگر طبقہ رائے دہندگان کو بھی حکمراں جماعت میں شامل کر لیا جائے تو بھی ممکن ہے کہ رائے دہندگان کا کل طبقہ غیر رائے دہندگان کے زیر اثر ہو مثلاً ہندوستان میں اسوقت تقریباً دس فیصدی آبادی کو رائے دہی کا حق حاصل ہے۔ بقیہ نوے فیصدی آبادی اگر چاہے تو اسے یہ قدرت حاصل ہے کہ وہ اس دس فیصدی آبادی کو اپنے زیر اثر کرلے لیکن یہ جو کچھ بھی ہو اس کا تعلق داخلی حیثیت سے ہے اس کا اثر صرف یہ ہوگا کہ جو قوت اس اقتدار پر اثر انداز ہوگی یعنے عملاً جس کے ہاتھ میں یہ اقتدار ہوگا وہی ذی اقتدار قوت کہلائیگی اس کو دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ داخلی حیثیت سے یہ سوال پیدا ہوگا کہ ذی اقتدار قوت کہاں مرکوز ہے؟ کہیں بھی ہو اگر سلطنت کے اندر اس قوت کا وجود ہے تو اس کے محل قرار کی بنا پر سلطنت کے استقلال و عدم استقلال پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ استقلال کے اعتبار سے یہ قوت ایک فرد واحد کے ہاتھ میں مجتمع ہو یا جملہ افراد قوم پر منقسم ہو دونوں برابر ہے۔

سلطنت کے استقلال و عدم استقلال پر جس شے کا اثر پڑتا ہے وہ خارجی اعتبار سے ہے یعنے اس اقتدار پر کسی خارجی سلطنت کا اثر ہے یا نہیں اس اثر کی مختلف حدیں اور مختلف شکلیں ہیں۔ یہ تو مسلم ہے کہ کوئی سلطنت جو دوسری سلطنتوں سے تعلقات رکھنا چاہتی ہے وہ ایک حد تک اپنے

---

[1] اگرچہ سلطنت کا لفظ خود اسکا خواہاں ہے کہ وہ ذی استقلال ہو مگر رواج عام کے مطابق ہم ناقص الاستقلال نظم سیاسیہ کو بھی سلطنت کہہ سکتے ہیں۔ اگر قطعی فرق قایم کرنا ہو تو اس موقع پر حکومت کا استعمال کیا جا سکتا ہے مگر اس کی ضرورت نہیں ہے۔

اور پر پابندیاں عاید کرنے پر مجبور رہے یہ پابندیاں دو قسم کی ہیں عام و خاص عام پابندیاں وہ ہیں جو مسلمہ حقوق الدول کے اعتبار سے ہر متمدن سلطنت کو دوسری متمدن سلطنتوں کی نسبت مرعی رکھنا پڑتی ہیں اس کی نہایت عام مثال سفراء کے حقوق ہیں جو زمانہ قدیم سے اسوقت تک یکساں طور پر مسلم چلے آرہے ہیں خاص پابندیاں وہ ہیں جو دو سلطنتوں کے درمیان خاص معاہدات کے ذریعہ سے عمل میں آتی ہیں مثلاً ترکی۔ چین اور جاپان نے کسی وقت میں بعض یورپی اور امریکی سلطنتوں سے ایسے تجارتی معاہدات کئے تھے جن سے ایک خاص معاملہ میں ان ایشیائی سلطنتوں کے اقتدار مطلق پر ایک حد قایم ہوگئی تھی۔ "استقلال" کا کل سوال اس آخری نوع معاہدات کی حد وسعت پر آکر معلق ہوجاتا ہے اگر یہ معاہدات اس نوع کے ہوں کہ ہر فریق کو قانوناً ان کے فسخ کردینے کا میعادی یا غیر میعادی حق حاصل ہو تو ان معاہدات سے کسی سلطنت پر خواہ کتنی ہی پابندیاں عاید ہوئی ہوں اسکے استقلال میں کوئی فرق نہیں پڑتا اس کے برخلاف اگر قانوناً کسی ایک فریق کو یہ حق نہ باقی رہجائے کہ اپنی مرضی سے ان معاہدات کو فسخ کرسکے۔ تو اس فریق مغلوب کی سلطنت غیر ذی استقلال ہوجاتی ہے خواہ اس کی مملکت وسیع آبادی کی کتنی ہی کثیر وسائل کتنی ہی اور تنظیم کتنی ہی اعلیٰ و ارفع کیوں نہ ہو مثلاً بلغاریہ اگرچہ ۱۸۷۸ء میں ترکی سے عملاً آزاد ہوگئی تھی مگر ۱۹۰۹ء تک قانوناً وہ ذی استقلال سلطنت نہیں تھی یہی حال جنگ عظیم تک مصر کا تھا۔ لیکن جنگ عظیم کے بعد جب مجلس ملیہ ترکیہ نے

مصر کے تعرد کا فیصلہ صادر کرایا تو مصر کو قانوناً ذی استقلال سلطنت کا درجہ حاصل ہوگیا برطانی احتلال یا اعلان الحاق قانوناً مصر کے استقلال کے منافی نہیں ہے عملاً جو صورت حال پیدا ہوگئی ہے وہ اصولاً قابل اعتنا نہیں ہے۔ نپولین کے دور سطوت میں جرمانیہ کی اس سے بدتر صورت حالات پیدا ہوچکی ہے خلاصہ یہ کہ سلطنت کے ذی استقلال ہونے کے لئے یہ لازمی و لابدی ہے کہ اس کا اقتدار اعلیٰ غیر مرضیہ طور پر کسی دوسری سلطنت کے زیر اثر نہ ہو اگر بہ رضامندی ایسا ہے تو جبتک سلطنت مفوضہ کی جداگانہ ہیئت برقرار رہے اور وہ اپنی ہیئت کو برقرار رکھنا چاہے اس وقت تک وہ ذی استقلال ہے۔ جب وہ اس ہیئت کو خود برقرار نہ رکھنا چاہے یا دوسری سلطنت اس کی اس ہیئت کو مٹادے اس وقت وہ غیر ذی استقلال سلطنت ہوجائے گی غیر ذی استقلال ہونے کے بعد اسکی حیثیت کیا ہوگی یہ ایک جداگانہ سوال ہے جو اس موجودہ بحث سے خارج ہے۔

مذکورہ بالا بیان سے نفس استقلال کے متعلق ایک مجمل اندازہ ذہن میں قایم ہوجاتا ہے نظری حیثیت کا جہانتک تعلق ہے مندرجہ بالا شروط و قیود اسلامی و یورپی دونوں نقطہائے نظر سے صحیح ہیں مگر عملی حیثیت میں آکر اسلامی اور یورپی خیالات میں بون بعید واقع ہوجاتا ہے اہل یورپ سلطنت کا منتہائے خیال "ہمہ گیر سلطنت" کو قرار دیتے ہیں اور ان کے وہاں اسکے دو نمونے ہیں ایک سکندر کی مختصر القیام شہنشاہی اور دوسرے رومیوں کی طویل المدت اور وسیع الحدود آمریت اور ان کا خیال ہے کہ دنیا میں کامل امن و سکون اسی وقت ہوگا کہ جب ساری دنیا ایک سلطنت کے تحت متحد ہوجائے گی ممالک اس میں مثل صوبوں کے ہوں گے اور قومیں مثل مختلف فرقوں کے ہونگی یہ تصور بجائے خود استقلال انفرادی کا منافی ہے مگر یہ خیال آرائی صرف فلسفیوں تک محدود رہے عمل کو اس سے سروکار نہیں اور محض یہی نہیں کہ سروکار نہیں بلکہ شہنشاہی روما کی شکست کے بعد سے یورپ نے مختلف ممالک و اقوام کے استقلال کو نہ صرف قانوناً و اصولاً جایز قرار دیدیا ہے بلکہ ان کے تمام سیاسیات کی بنا اسی پر قایم ہوگئی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اسلامی نقطہ نظر بھی استقلال متفرقہ کو شرعاً و اصولاً جایز قرار دیتا ہے یا نہیں اور اگر نہیں قرار دیتا تو خلافت عباسیہ کے وقت سے جو مختلف سلطنتیں مسلمانوں کی قایم ہوتی رہی ہیں ان پر اسلامی نقطہ نظر سے "استقلال" کا اطلاق جایز ہوگا یا نہیں اگر جایز ہوگا تو ان کی حیثیت کیا ہوگی۔ صلح حدیبیہ (۶ھ) کے شرایط میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ جو نو مسلم اہل مکہ کے پاس سے بھاگ کر مدینہ آئیں وہ قریش کو واپس کردئے جائیں۔ عتبہ بن اسید شرط کے مطابق واپس کردئے گئے انھوں نے راستہ میں ایک محافظ کو قتل کرڈالا اور سمندر کے کنارے ایک مقام عیص میں ایک مامن بنالیا دوسرے مسلمان بھی جو قریش کے پنجہ ستم میں گرفتار تھے بھاگ بھاگ کر وہاں آنے لگے اور تھوڑے ہی دنوں میں ان لوگوں نے اپنی

ایک جمعیت بنالی اور قریش کے قافلوں کو لوٹنے لگے۔ "استقلال" سلطنت کے جملہ شروط و قیود اس مختصر گروہ پر بالکل صحیح صحیح صادق آتے تھے اور یورپی نقطہ نظر سے انھیں ایک مستقل سلطنت کی حیثیت حاصل تھی مگر کیا اسلامی نقطہ نظر سے بھی ایسا ہی تھا یا ہوسکتا تھا اس سے بھی مشکل تر مسئلہ یہ ہے کہ حضرت علیؓ اور امیر معاویہ میں صلح ہوجانے اور حضرت امام حسن کے درمیانی زمانہ میں امیر معاویہ کی حیثیت کیا تھی؟ آیا ان کی سلطنت یا امارت استقلال کے وصف سے متصف ہوسکتی تھی یا نہیں پھر خلافت عباسیہ کے قیام کے بعد مغربی ممالک اسلامیہ تو علی الاعلان اس خلافت سے علیحدہ ہوگئے مگر مشرقی ممالک اس سے وابستہ رہے لیکن طاہرین کے وقت سے خارزمیوں کے زوال تک جو مختلف حکمراں خاندان مشرق میں ہوئے اور جو عملاً آزاد تھے مگر رسماً خلیفہ وقت کی اطاعت کا اظہار کرتے تھے۔ وہ "مستقل" تھے یا نہیں؟ الپتگین جب سامانیوں سے کنارہ کش ہوکر ہندوکش پر خیمہ زن ہوا اور چند پہاڑیوں پر قبضہ کرکے ہندوستان پر حملہ کرنے لگا اسکی اس مختصر جماعت پر "استقلال" کے جملہ لوازم اسی طرح صادق آتے تھے جس طرح محمود کی فتوح سے آذربائیجان تک پھیلی ہوئی سلطنت پر صادق آتے تھے لیکن خلیفہ وقت کا فرمان حاصل کرنے کے قبل تک الپتگین سبکتگین اور محمود کی حقیقت اسلامی نقطہ نظر سے یہی تھی۔ سامانیوں سے وہ منقطع ہوگئے تھے خلیفہ سے براہ راست انکا تعلق قایم نہیں ہوا تھا۔

غرض اسلامی نقطہ نظر سے "استقلال" کا کل مسئلہ ایک نہایت ہی پیچیدہ و نازک مسئلہ ہے میں اسوقت اسے اصولی طور پر حل کرانے کی سعی نہیں کرنا چاہتا بلکہ دنیا جس طریق پر عمل پیرا ہے اس کے بموجب یہ تسلیم کرلیتا ہوں کہ "استقلال" کی اصولی شرائط جن فرماں روایان اسلام پر صادق آسکتی ہیں وہ مستقل فرماں روا تھے اور ہیں خواہ وہ حضرت اورنگ زیب عالمگیر کے مانند ایک ایسی شہنشاہی پر حکمراں ہوں جو ایک بر اعظم کی حیثیت رکھتی ہو یا اس سے بھی بڑھ کر سلیمان ذیشان کے مانند تین بر اعظموں پر ان کا حکم رواں ہو خواہ وہ عرب کے کسی چھوٹے سے قبیلہ کا خود مختار شیخ ہو جس کے پاس چند نخلستان کے سوا کچھ نہو دنیا کے مروجہ طریق عمل و اصول کے مطابق یہ سب مستقل فرمانروا قرار پائیں گے۔

این ہمہ عزت مقصود آن بود
کانجہان دراین جہاں آید ہمی

ایک وابستہ دامن دولت آصفیہ کے لئے آخری و اہم سوال یہ ہوتا ہے کہ آیا (علی رغم المعاندین) نظری اصولوں اور عملی کارروائیوں کو دیکھتے ہوئے سلطنت ابد قرار آصفیہ کے "استقلال" اور قطعی استقلال کے نسبت کوئی ادنی شبہہ بھی ذہن میں وارد ہوسکتا ہے خالص سلطنت کے لوازم، مملکت آبادی، وحدت، تنظیم سب بدرجہ اتم و اکمل موجود ہیں ذی اقتدار قوت اس کے اندر مرکوز ہے وہ ذی اقتدار قوت کسی غیر مرضیہ معاہدے سے اپنے کسی عمل میں پابند نہیں ہے۔ قانوناً وہ کسی معاہدہ کے ختم یا فسخ کر دینے کے ناقابل نہیں ہے جملہ معاہدات مساویانہ حیثیت میں ہیں استیلا و تغلب کو اصولاً و قانوناً کوئی دخل نہیں ہے اور نہ کبھی ظلم کا استیلا و تغلب کسی وقت تسلیم کیا گیا ہے متعاہد سلطنتوں کی تناسبی قوت کی تقلیل و تکثیر کو بین الاقوامی قانون میں کوئی وزن حاصل نہیں ہے اور آخری امر یہ ہے کہ متعاہد سلطنتوں میں سے کسی ایک سلطنت کے داخلی تغیرات کا کوئی اثر دوسری سلطنت کے تعلق پر نہیں پڑتا یہ آخری امر قدرے توجہ کا محتاج ہے، ایسٹ انڈیا کمپنی کی دو حیثیتیں تھیں برطانی و ہندوستانی برطانی حیثیت میں اسے چارلس دوم نے ایشیائی سلطنتوں سے صلح و جنگ کا اختیار دیدیا گویا اس طرح اسے ایشیا میں ایک ذی اقتدار قوت بنا دیا تھا ہندوستانی حیثیت میں ایسٹ انڈیا کمپنی مغلی شہنشاہوں کے صوبہ دار کی نوعیت رکھتی ہے جو معاہدات ایسٹ انڈیا کمپنی سے اور ہندوستان کے دیگر والیان ملک سے ہوے وہ انھیں دو حیثیتوں کے لحاظ سے ہوے حیثیت اولی کے اعتبار سے کمپنی کی ہیئت کارفرمائی میں جو کچھ تغیرات ہوے وہ داخلی حیثیت کے ہیں تا آنکہ کمپنی کا منسوخ ہوجانا اور اس کے انصرام مہمات کا راست پارلیمنٹ کے ہاتھ میں آجانا سب اس کے داخلی تغیرات میں شامل ہیں دوسرے متعاہد فریق کو اس سے کوئی سرکار نہیں سلطنت برطانیہ اپنی نوعیت میں جو کچھ بھی ہو اس متعاہد فریق کو اس سے کوئی غرض

نہیں جس نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے معاہدات کیے ہوں سلطنت برطانیہ کی مختلف نوعیتیں انکا ملنڈ اور ہنیو ور کے سابقہ تعلقات سے ظاہر ہیں اور اس وقت تک انگلستان سے عین ملے ہوئے جزائر رودبار انگلستان اور ایل آف مین میں پارلیمنٹ برطانی کے اختیارات من حیث برطانیہ نافذ نہیں ہیں ہندوستان کے والیان ملک کے لئے سیدھا اور صاف راستہ کھلا ہوا ہے کہ سلطنت کی داخلی حیثیت و نوعیت میں کوئی سا تغیر ہو جائے انہیں اس سے واسطہ نہیں ہے وہ سلطنت برطانیہ کے ساتھ تاجدار سلطنت ہندیہ مساویانہ درجہ رکھتے ہیں اور اس سے زائد ان کے حیطۂ تعلقات سے خارج ہے میدان بحث وسیع ہے مگر مجال بہت تنگ ہے

بیش ازیں گفتن تواں تر حش دلے
از سوے غیرت نشاں آید ہمی

خلاصۃ الکلام یہ کہ جس حیثیت اور جس نوعیت سے غور کیا جائے سلطنت ابد قرار آصفیہ کو باستقلال سلطنت ماننا پڑتا ہے اور وہ باستقلال سلطنت ہے۔

پائندہ باد استقلال آصفیہ

تا ابد پاینده بادا بارگاه آصفی

از جناب مولوی مسعود علی صاحب محوی بی اے آنرز رکن دار الترجمہ

فصل گل آمد دگر پہنای عالم روشن است / مخیم رندان میکش باز صحن گلشن است

بر زمیں باد شمال و ابر بسیار آب رواں / زیر پا فرش زمرد بر سر ابر بہمن است

شبنم شاداب افشانده است خرمنہا گہر / زاں گہر دشت و جبل آموده جیب و دامن است

بلبل باغ محبت مے سراید ایں غزل / با دبیر قصد بشادی شاہد گل کف زن است

ہر نگاه نازت، اے ناز آفرین دل افگن است / تا توئی پیش نظر ہر دشت دشت ایمن است

جلوه گاه حسن تو تنہا نہ باغ است و بہار / منظر زیبائیست ہر کوچہ و ہر برزن است

ہر کسے داند بسوے خود رخ تابان دوست / ہمچو آں شمعیکہ پیش اہل محفل روشن است

در حریم سینہ میسوزم چراغ داغ عشق / در چراغ زندگی تا قطرۂ از روغن است

غیر انساں نیز در بازار عالم جنسہاست / گرمی بازار را لیکن سبب ایں یک تن است

اے سزاوار شرف دستے برآر از آستیں / تا شود پیدا کہ مردے اندریں پیراہن است

عشق پیدا کن کہ در عشق است لذتہا بسے / سوز و درد عاشقی رونگر جان و تن است

چشم بند از خلق تا بینی رموز کائنات / چشم سربستن ز عالم چشم دل وا کردن است

تخم نیکی کار اینجا گرچہ باشد کم ز جو / آنچہ کاری دانہ است امروز فردا خرمن است

دستگیر ہم نشیں شو کم مباش از چوب خشک / چوب در دریا نگر چوں دستگیر آہن است

کے شوی آزاد از خیل پرستاران سرو / تا ترا طوق غلامی فاختہ در گردن است

شہر آباد است و ماوائے سگان جیفہ خوار — دشت ویران است و شیران خدا را مسکن است

شد تہی خمخانۂ ایام از صاحبدلاں — راست گر پرسی دریں ایام صاحبدل دن است

میدہد ہر تشنہ لب را جامہا از بادۂ — کاں روان فروز عشرت آور دغم افگن است

جز یکے خورشید خورشیدے دگر پیدا نکرد — عمرہا بگزشت میگویند شب آبستن است

آفتاب دین و دولت شمع بزم علم و فن — نیست جز شاہ دکن بر اہل عالم روشن است

حضرت عثمان علی خاں آنکہ ذکر خیر او — چارسو پرشیدہ در عالم چو بوی چندن است

از کتاب فضل بے اندازہ شاہانہ اش — ہر حکایت دلکش است و ہر روایت احسن است

پادشاہ ماست یا ہارون و یا مامون عہد — حیدرآباد است یا علم و ہنر را معدن است

میرسد شاہ جواں طالع بصد جاہ و حشم — میمنت جائے جنیبت فتح جائے توسن است

بر سر تاج شہامت سایۂ بال ہما است — زیر پائے توسن اقبال فرق دشمن است

رونق بازوے پر زور است گر حرز دعا — عقد حسن اعتقاد خلق زیب گردن است

زیں ہمہ بگزر دعائے خلق بہر پادشاہ — ہم فسون تیغ بند و ہم دعائے جوشن است

تا ابد پایندہ بادا بارگاہ آصفی — کاں غریباں است ملجا بیکساں را مامن است

جز فن مہر و وفا از محوی مسکین مجو
نیک میدانی کہ او بیچارہ مرد یک فن است

قیام سلطنت آصفیہ

از مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ایم ۔ اے ال ال بی پروفیسر جامعہ عثمانیہ

دکن کی سلطنت آصفیہ حقیقت میں اُن پرآشوب حالات کا نتیجہ ہے جو اٹھارویں صدی کے نصف اول میں ہندوستان پر چھائے ہوئے تھے۔ حضرت اورنگ زیب کے انتقال کے بعد ہندوستان کا جو حشر ہوا۔ اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں مشکل ملتی ہے۔ مرکزی حکومت صفر ہوگئی تھی اور ہندوستان کے تمام طول وعرض میں ایک حیرت انگیز تہلکہ مچا ہوا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ جب مرکزی حکومت کی بندشیں ڈھیلی پڑجاتی ہیں تو ہمیشہ ہر بڑے ملک کا یہی قدرتی نتیجہ ہوتا ہے۔ ہندوستان کا وسیع رقبہ جس میں مختلف ملتیں اور معاشرتیں موجود ہیں اس کی حکومت کیلئے ہمیشہ ایک زبردست قوت کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت مغل شہنشاہوں کے غیر معمولی تدبر او سیاسی قابلیت سے پوری ہوئی تھی۔ چنانچہ مغل حکمرانوں نے اپنی زبردست حکومت سے ہندوستان کو جنت نشان بنا رکھا تھا۔ علمی سرگرمی اور دولت کی فراوانی میں اس زمانہ کا کوئی ملک ہندوستان کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا لیکن جوں ہی یہ شخصیتیں ایک ایک کرکے مٹ گئیں اور زبردست حکومت کا سلسلہ عالمگیر اعظم کے انتقال پر ختم ہوا ملک کے تمام طول وعرض میں ایک سیاسی کشمکش شروع ہوگیا۔ امن و امان غائب اور ہر طرف ایک ہو کا عالم تھا۔ ایسے وقت میں جبکہ ہر قسم کی سیاسی مایوسی ہوا اور حکمران خاندان کے اراکین سے آئندہ زندگی کی کوئی توقع نہ ہو تو موجودالوقت ارباب سیاست کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے پیر پر کھڑے ہوں اور اپنی بساط کے موافق پچھلی عظمت کو قائم رکھنے کی کوشش کریں کیونکہ سوکھے درخت کی آبیاری میں محنت و زر ضایع کرنا بےفائدہ ہے عین عقلمندی یہ ہے کہ اس کی جگہ جدید پودے لگائے جائیں جو اپنی نئی زندگی سے بہت نہیں تو تھوڑا فائدہ پہنچائیں چنانچہ ایسے نازک وقت میں تمام مدبر جن میں تھوڑی بہت سمجھ اور سیاسی دانائی ہوتی ہے یہی کرتے ہیں۔ ہندوستان میں اٹھارویں صدی کی افراتفری کے عالم میں یہی ہوا۔ اس وقت دور ماضی کے جو مدبر رہ گئے تھے جن میں سلطنت آصفیہ کے بانی حضرت آصفجاہ اول میں انہوں نے ایک عرصہ تک گرتی ہوئی عمارت کو سنبھالنے کی کوشش کی اور پرانے شاہی خاندان کا ساتھ دیا لیکن جب اس خاندان سے قطعی مایوسی ہوگئی تو سب ان مدبروں نے اپنے پیر پر کھڑے ہونے کی کوشش شروع کردی یہ تمام کوئی بغاوت اور غداری نہیں تھا بلکہ عین وفاداری اور اس وقت کی حالت کو ملاحظہ کرتے ملک کی بہبودی کا یہی ایک ممکنہ طریقہ تھا۔ یوں تو مغلوں کے عظیم الشان دور حکومت نے بہت سے سیاسی مدبر پیدا کئے تھے۔ لیکن اس وقت ان تین گنتی کے آدمیوں کے سوا جن میں حضرت آصفجاہ اول برہان الملک سعادت خاں اور مرشد قلی خاں شامل ہیں اور کوئی ایسا شخص نہیں تھا جو صحیح معنی میں مدبر کہا جاسکے۔ یہ لوگ حضرت اورنگ زیب کے پیدا کئے ہوئے اور دور ماضی کے تربیت یافتہ تھے۔ مرکزی حکومت کی مایوسی نے ان مدبروں کو علیحدہ علیحدہ کوشش کیلئے مجبور کیا کہ اگر مرکزی حکومت نہیں سنبھالی جاسکتی تو کم از کم اتنا ہونا چاہئے کہ کچھ محدود حلقوں کو اپنے ہاتھ میں لیکر وہاں امن و امان قائم رکھیں اور گذشتہ عظمت کو برقرار رکھنے کی کوشش کریں ورنہ مرکزی حکومت کا قائم رکھنا اور پورے ہندوستان کو مجموعی حکومت کے تحت لانا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرادہ فرادہ جدوجہد شروع ہوگئی اور اپنی اپنی علیحدہ سلطنتیں قائم کرلی گئیں۔

ان حالات میں اسی بات کی ضرورت تھی سلطنت آصفیہ ان مبارک کوششوں کا پھل ہے جو اٹھارویں صدی کے اوائل میں منظر عام پر آگئی مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ان سہ گونہ کوششوں میں صرف آصفجاہ اول کی کوشش ایسی تھی جو

بار در ہوئی اور باقی کوششیں بالکل رائگاں گئیں۔

مرشد قلی خان کی بے وقت موت نے بنگال کی کمائی ہوئی دولت کو ضائع کر دیا۔ ابھی اس کے منصوبے پورے نہیں ہوئے تھے کہ ۱۷۲۵ء میں اس کا انتقال ہو گیا اور اس کے جو جانشین آئے تو ان میں کوئی سیاسی قابلیت نہیں تھی، اور پھر آپس کی خانہ جنگی نے اور بھی کام خراب کر دیا اور سمندر کا سامنا ایسا تھا کہ پلیسیوں کی بڑھتی ہوئی طاقت نے نواب مرشد قلیخاں کی تمام آرزو خاک میں ملا دی۔ دوسری طرف اودھ کا زرخیز خطہ جس طرح قدیم زمانہ سے بڑے بڑے آوروں کی حرص و آز کا نشانہ بنا رہا اسیطرح انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ کا شکار ہو گیا حکمران لاکھ مدبر ہوں تو کیا مختلف بہانوں سے اس سلطنت کا خاتمہ کر دیا گیا اس سلطنت کے بانی برہان الملک اور ان کے جانشینوں کی تمام امیدوں پر پانی پھر گیا برخلاف اس کے سلطنت آصفیہ صرف واحد سلطنت ہے جو ابتک قائم ہے اور ہمیشہ قائم رہے گی اس کے قیام و استحکام سے خود ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس کی بنیاد رکھنے میں کسقدر دور اندیشی کام میں لائی گئی اور اس کے بانی کی کیا شخصیت تھی۔ حضرت مغفرت مآب ان لوگوں میں سے ہیں جن میں قدرتی طور پر غیر معمولی قابلیت ودیعت کی گئی تھی جو انکے بزرگوں سے ورثہ میں ملی تھی آپ کے باپ دادا نے اورنگ زیب کے عہد میں عظیم الشان خدمات انجام دیکر شہنشاہ سے خراج تحسین حاصل کیا تھا اور بہت سے خطاب اور مناصب پائے تھے دوسرے حضرت آصفجاہ کو عالمگیر اعظم کی سیاسی تربیت نصیب ہوئی تھی پھر زمانہ کی پر آشوب حالت نے ان کو ہر طرح کے سبق سکھائے دئے تھے ظاہر ہے کہ اس تدبیر اور ذہنیت کے ساتھ جو بنیاد پڑے گی ان کا پختہ ہونا ضروری ہے دوسرے سلطنت کیلئے جو موقعہ اختیار کیا گیا وہ اسطرح کمزور نہیں تھا جیسے بنگال اور اودھ دکن کی سرزمین دریائے نربدا کے پار ہونے کی وجہ سے شمال کے تمام تہلکوں سے ہمیشہ محفوظ رہی۔ شمال وجنوب کے درمیان دو پہاڑ اور ایک دریا حائل ہے اور اس کا ہمیشہ یہ نتیجہ رہا ہے کہ قدرت نے جنوب کو شمال اور اس کے اثرات سے تقریباً جدا رکھا اس کے علاوہ دکن ایک سطح مرتفع ہونے کے ساتھ اتفاق سے دو گھاٹیوں کے درمیان واقع ہوا ہے اور یہ ایسا قدرتی موقعہ ہے کہ قیام سلطنت کے لئے اس سے بہتر کوئی اور موقعہ نہیں ہو سکتا۔ حضرت آصفجاہ کا یہاں قدم جمانا اور سلطنت قائم کرنا انتہائے دور اندیشی تھی۔ مزید براں حضرت آصفجاہ دکن کے جغرافیہ اور سیاسیات سے خوب واقف تھے دکن کے اکثر معرکے ان کے ہاتھ پر سر ہو چکے تھے حضرت اورنگ زیب کے انتقال کے وقت بیجاپور کے صوبہ دار تھے۔ چنانچہ دکن میں سوائے حضرت آصفجاہ کے کوئی دوسرا شخص سلطنت قائم نہیں کر سکتا تھا غرض یہ اسباب تھے جو سلطنت آصفیہ کے استحکام کے باعث ہوئے اور ابتدا ہی سے قرائن یہ کہتے تھے کہ اس سلطنت کے پائدار ہونے میں کوئی شبہ نہیں اس پر طرہ یہ کہ حضرت آصفجاہ کے جتنے جانشین ہوئے وہ سب کے سب لائق ہوئے اور ان لائق جانشینوں نے ہر وقت اور ہر زمانہ میں اپنے خاندانی وقار کو قائم رکھنے میں کوئی بات اٹھا نہیں رکھی۔

ممکن ہے کہ تنگ نظر مورخ اس قیام سلطنت کو مغل خاندان کے خلاف بغاوت پر محمول کرے لیکن غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ حضرت آصفجاہ کا دکن میں خود مختار ہونا ایک ناگزیر چارۂ کار تھا اور یہی اعلیٰ وفاداری تھی اس پر آشوب زمانہ میں جب کہ ہندوستان کی اینٹ سے اینٹ بج رہی تھی۔ دکن کے محدود رقبہ میں مغل حکومت کے آثار ہمیشہ کیلئے باقی رکھنا وفاداری نہیں تو کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ حضرت آصفجاہ نے حضرت اورنگ زیب کے انتقال کے بعد ۱۷۲۳ء تک تقریباً ۱۵ سال مرکزی حکومت کو بھی اپنی کوششوں کا محور بنائے رکھا تھا تمام تاریخی واقعات اس بات کے شاہد ہیں کہ حضرت مغفرت مآب نے ہر آڑے وقت میں اورنگ زیب کے جانشینوں کی مدد کی۔ محمد شاہ کو سادات بارہہ کے پنجہ سے چھڑایا اور اپنی غیر معمولی جرات سے نادر کی مزید خونریزی کا سدباب کیا۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ۱۷۲۳ء تک اس مدبر کی تمام جد و جہد اس امید میں ہوتی رہی کہ ہندوستان کی مغل حکومت پھر اس آن بان سے قائم ہو جائے جیسے خود اورنگ زیب اور شاہجہاں کے زمانہ میں تھی لیکن سادات بارہہ کے میدان سے ہٹنے کے بعد ہی محمد شاہ میں کوئی زندگی کے آثار نظر نہیں آئے اور مزید انتظار میں وقت کھونا بیفائدہ تھا اس لئے ۱۷۲۳ء میں

حضرت مغفرت مآب نے دکن میں خودمختاری کا ارادہ کرلیا چونکہ مغل حکومت اپنے مرکز پر نہیں آسکتی تھی اس لئے کل کیلئے جز کو چھوڑ دینا خلاف دوراندیشی تھا۔ لہذا انہوں نے ایک چھوٹے سے رقبہ کو مستحکم کرلینا ضروری خیال کیا اور جو اس زمانے کے سیاسی حالات کا لحاظ کرتے ہوئے معقول تھا چنانچہ اس دوراندیشی کا نتیجہ ہے کہ پرانی سلطنت کی ایک یادگار سلطنت آصفیہ اب تک ہمارے سامنے موجود ہے اور ہمیشہ رہے گی ورنہ اگر حضرت آصفجاہ صرف رسمی وفاداری پر اڑے رہتے یعنے صرف محمد شاہ کا ساتھ دیتے تو خود مغل سلطنت تو مٹ رہی تھی اس کے ساتھ دکن بھی مرہٹوں کے ہاتھ کا کھلونا ہو جاتا لیکن ساتھ ہی ہم اس بات کو فراموش نہیں کرسکتے کہ گو حضرت آصفجاہ نے دکن کو خودمختار تو کرلیا لیکن خاندان مغلیہ کی وفاداری کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا چنانچہ خاندان آصفیہ کے جملہ اراکین آج تک مغل خاندان کی وفاداری کا دم بھرتے رہے ہیں۔ وفاداری کا سب سے بین ثبوت یہ ہے کہ خودمختاری کے بعد دکن کا جو سکہ بنا تو وہ ٹھیٹ آصفجاہی نہیں بنایا گیا بلکہ اس پر قدیم مغل سلطنت کی علامت باقی رکھی گئی چنانچہ سکہ کے ایک طرف محی الدین اورنگ زیب تو دوسرے طرف نظام الملک آصفجاہ کے نام ثبت کرائے گئے۔ یہ سکہ حال حال تک حیدرآباد میں جاری تھا۔ نیز یہ مشہور ہے کہ چوتھے نظام حضرت ناصرالدولہ بہادر کو مرتے دم تک یہ آرزو تھی کہ مغل حکومت پھر از سر نو قائم ہو اور خاندان آصفیہ پھر ان کی خدمت کرے۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ کوئی وفاداری نہیں ہوسکتی

قیام کے زمانہ سے لیکر آج تک سلطنت آصفیہ نے ہندوستان کے سیاسی اور معاشرتی حالات پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے یہ تاریخ ہند کا سب سے بڑا ورق ہے اگر تاریخ سے یہ ورق خارج کردیا جائے تو اٹھارویں صدی کے اوائل سے لیکر آج تک کے واقعات سمجھنا ناممکن ہے جنوب ہند یا یوں کہئے کہ تمام ہندوستان میں اس سلطنت نے ایک زبردست اقتدار حاصل کرلیا تھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے ایک طرف جنوب کی تمام پریشان طاقتوں کو آگے بڑھنے سے روکا اور ہر وقت ان کی ترقی میں رکاوٹ پیدا کی اور دوسری طرف یہ سلطنت مغربی اقوام کی ترقی میں بھی سدراہ ثابت ہوئی اور یہی وجہ تھی کہ مغربی اقوام کو اپنا قدم جمانے کیلئے اس سلطنت کا اتحاد حاصل کرنا ضروری تھا چنانچہ وارن ہیسٹنگز اور ولزلی کے عہد میں صرف حیدرآباد کے اتحاد نے تمام گتھیوں کو سلجھا دیا ورنہ بغیر اس کلید کے سیاسی مطلع بالکل تاریک رہتا غدر کے زمانہ میں اس سلطنت نے جو مدد کی ہے وہ موجودہ حکمرانان ہند کو معلوم ہے

اس طریقہ سے سلطنت آصفیہ قدیم و جدید زمانہ کا سنگم ہے اوپر سے اس کے قدیم مغل سلطنت کے ساتھ ڈانڈے ملے ہوئے ہیں کہ یہ اسی عظیم الشان سلطنت کا باقی ماندہ حصہ ہے اور اس کے نظم و نسق میں ابھی تک قدیم مغل سلطنت کے آثار موجود ہیں اور پھر اس سلطنت نے ہندوستان میں عہد جدید پیدا کرنے میں زمانہ حال کی بہت مدد کی ہے۔ ہندوستان کی تہذیب جدید کو اسی سلطنت نے آگے بڑھایا چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کی موجودہ تہذیب سلطنت آصفیہ کی بہت ممنون ہی نہیں بلکہ خود سلطنت کی سیاست اور معاشرت اپنے جدید تجربات سے زمانہ قدیم سے ایسا مواد تیار کرتی رہی ہے جو اس وقت اور آگے چلکر ہندوستان کیلئے نہ صرف مفید بلکہ ناگزیر ثابت ہوگا۔ سلطنت آصفیہ نے اپنے تجربہ سے ہمیشہ یہ دیکھا کہ ملک کیلئے جدید تہذیب اسوقت تک مفید نہیں ہوسکتی جب تک اس میں قدیم تہذیب کی چاشنی نہ رکھی جائے اور حقیقت یہ ہے کہ زندگی ہر شعبہ میں نہ ٹھیٹ قدیم تہذیب مفید ہوسکتی ہے نہ بالکل جدید بلکہ دونوں عناصر کے ایک مشترک مواد کی ضرورت ہے تاکہ وہ رفتار زمانہ کا بھی ساتھ دے سکے اور قدیم روایات اور طبائع کو بھی ناگوار نہ گزرے۔ سلطنت آصفیہ نے یہی کیا ہے اور زندگی کے ہر شعبہ میں قدیم و جدید دونوں عناصر شامل کرکے پورے ہندوستان کیلئے ایک بیش بہا مواد تیار کیا ہے جو آج نہیں تو کل ہندوستان کیلئے ضروری ہے اور اسی کے نہ ہونے سے آج تک ہندوستان کو سخت نقصانات برداشت کرنے پڑے سیاسی شعبہ کو دیکھو تو سلطنت آصفیہ نے جدید معاشرت کے ساتھ ساتھ قدیم مغل سلطنت کے بہت سے پہلو باقی رکھے ہیں اور یہ مشترک نمونہ ملک کیلئے

ہر طرح مفید ثابت ہوا ہے۔ علمی جدوجہد دیکھو تو اس میں بھی یہی اصول مدنظر رکھا گیا ہے ۔ جدید معلومات کا خوشی سے خیر مقدم کیا گیا مگر ان کو اپنی زبان میں داخل کرکے اہل ملک کے سامنے پیش کیا گیا تاکہ وہ نامانوس نہ ہوں اور اس کے عملی فوائد بالکل غائب نہ ہوں جیسے ہندوستان کی تعلیم سے ہو رہا ہے۔ یہی اصول پیش نظر رکھ کر آج عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام کیا گیا ۔ تمام نظم ونسق میں تجربہ کرنے کے بعد کہ دونوں عناصر کہاں تک مفید ثابت ہو سکتے ہیں یہ یونیورسٹی ... نہ صرف ملک کیلئے مفید ثابت ہوا بلکہ ہندوستان کے ہر گوشہ میں اس کے خیر مقدم کیلئے آواز بلند ہو رہی ہے اور یہ سب سلطنت کے ایسے تجربے ہیں کہ ہندوستان کو اس پر کاربند ہونا لازمی ہے یہ سلطنت کا عظیم الشان کارنامہ ہے کہ اس انگریزی ماحول میں جبکہ تمام دنیا پر انگریزی غالب ہے نہ صرف اپنی زبان کو قائم رکھا اور ترقی دی بلکہ اکثر مشرقی علوم کی بھی سرپرستی کی ۔ کیا اس بات کو ہندوستان اور ہندوستانی ... نہیں کہ سلطنت آصفیہ کی علمی پرستی نے ہندوستان کے مختلف گوشوں پر کیا احسانات کئے ہیں ۔ حیدرآباد نے ہندوستان کی ہر بڑی علمی تحریک کی مدد کی اور ہر علمی ادارہ کی دستگیری کی ۔ غرض سلطنت آصفیہ نے مختلف پہلوؤں سے ہندوستان کی سیاست اور معاشرت پر بہت اثر ڈالا ہے اور قارئین کہتے ہیں کہ آئندہ بھی یہ سلطنت ہندوستان کی ہر معاملہ میں مسیحائی کرے گی ۔

خود مختاری

از مولوی سید علی اصغر صاحب بلگرامی

آزادی (غلامی) درحقیقت حکومت کی ضد کا نام ہے یہ وہ شیرینی ہے جس میں حکومت کی تلخی سراسر معدوم ہوتی ہے ۔

افراد عالم بالعموم دو حالتوں میں مبتلا پائے جاتے ہیں وہ معاملات دنیوی میں بعض معینہ شرائط و وظائف کے محکوم ہیں یا ان قیود سے آزاد ہیں جنکی زنجیروں میں عوام جکڑے ہوئے ہیں ۔ عالم حیوانات پر ایک نظر ڈالی جائے تو پرند بمقابلہ چرند کے لطف آزادی سے زیادہ بہرہ ور ہیں، چرند پر پرندوں کو طبعی تفوق یہ حاصل ہے کہ طبقہ زمین پر دسترس حاصل ہونے کے علاوہ فضائی عالم کی سیر سے بھی تمتع حاصل کرنیکی صلاحیت ان میں موجود ہے بلحاظ اختلاف مدارج انسانوں کی بھی یہی حالت ہے کہ عوام جس کو آزادی کی سرحد تصور کرتے ہیں خواص کی اس سے تسکین نہیں ہو سکتی ہے، ان کا معیار آزادی اس سے بہت بلند ہے ۔ عوام اپنی پرواز فکر تک رسائی حاصل کرکے خوش و مطمئن ہو جاتے ہیں لیکن خواص کی منزل مقصود اس سے کوسوں دور ہوتی ہے

قوموں کا عروج و زوال بھی انہی تاثرات کے زیر اثر رہتا ہے ۔ قوم جس لفظ سے عبارت ہے وہ کسی طبقہ کے جمہور انام کو نہیں کہتے بلکہ بلا تفریق مذہب و ملت قوم ان چند افراد کے مجموعہ کا نام ہے جو کسی طبقہ کے حقیقی رہنما اور ترقی خواہ ہوں ۔ اب ان افراد کی پھر تحلیل کیجائے تو اس مجموعہ کی سیادت ایک یا چند افراد سے متعلق ہوگی اور ان میں جو سب سے زیادہ ذی ہوش ہوگا وہی سید القوم کہلائیگا ۔ اس سردار کو ہر زمانہ میں مختلف ناموں سے یاد کیا گیا ہے فی زمانہ یہ صدر جمہوریہ یا بادشاہ کے نام سے ملقب ہے ۔ صدر یا بادشاہ کے کارفرمائی کی خوبی یہ ہے کہ وہ قوموں کے سود و زیان کی ضامن ہو اور صدر کے معیار آزادی کی منزل مقصود یہ ہوتی ہے کہ وہ افراد کو انفرادی اور مجموعی حیثیت سے ہر شعبہ زندگی میں شاہراہ ترقی پر گامزن دیکھے اور قوم کے ماتحت طبقوں کو اس بلند درجہ پر فائز کردے جس کا نام تمدن و تہذیب ہے ۔ اس مقصد کے حصول کیلئے وہ اپنی دانشمندی اور افراد کے کارکن گروہ سے مدد لیتا ہے ۔

آزادی کا فطری احساس ہر انسان کا پیدائشی حق ہے، حصول آزادی کی کوشش ہر ملک اور ہر زمانہ میں ہوتی رہی ہے ۔ مصری، بابلی، اسوری

کلدانی، رومی، یونانی، ہندی، ایرانی، اور تاتاری قوموں نے ہمیشہ محکومی اور غلامی کے مقابلہ میں آزادی کو عزیز رکھا ہے۔ اس مقصد کے حصول کیلئے انہوں نے بڑے پُرغرور قوموں اور پُرعظمت وجلال سلطنتوں کو پسپا کیا۔ لیکن جو آزادی نیکی اور علم کے اوصاف سے عاری رہی وہ خلایق کی بہبودی کے کام نہ آسکی اور حصول آزادی کے بعد اوس سے جو اعلیٰ اور مفید نتائج پیدا ہونا چاہئے تھے نہ پیدا ہوسکے۔

دنیا کی اولوالعزم قوموں کے زوال کا راز قوت واختیار اور علم ونیکی کی جدائی میں مضمر رہا ہے زمانۂ حال کی تعلیم کا سب سے درخشاں نقص یہ ہے کہ ارباب حل وعقد کا رجحان طبع یہ ہوگیا ہے کہ ان تمام مزاحمتوں کو یکسر دور کردیا جائے جو حصول علم کی راہ میں حایل ہوتی ہیں۔ حالانکہ حصول علم کا اس شخص کو کوئی حق حاصل نہیں ہے جس کی اس کو طلب صادق نہ ہو، ایسی ناقص پیداوار جماعت کے حق میں خطرناک اور غیرمفید ہی ثابت ہوسکتی ہے۔ انسان کی طبیعت کو نیکی کی طرف مایل کردینا آسان نہیں ہے۔ لیکن اس سے زبردستی نیک کام کرادینے میں کیسا دشواری ہے۔ ہم کو تعلیم یافتہ فوج کے بجائے نیک اور ایماندار لوگوں کی زیادہ ضرورت ہے اس وقت ملک میں کونسا دارالعلوم ہے جس میں جودت وچالاکی کے مقابلہ میں ایمانداری کی پرسش ہوتی ہو یا جہاں نیکی اور فضایل اخلاق اور فرائض انسانیت شرمندۂ تدریس ہوتے ہوں۔ اخلاق کو پاک وپاکیزہ رکھنا اور راستی کردار کی دولت سے فرزندان ملک کو مالامال کرنا ایسا غیرضروری مضمون سمجھا جاتا ہے جس کی ہمارے نصاب تعلیم میں کوئی جگہ نہیں ہے ہم ایسے متحرک مجسموں سے بیزار ہیں جن میں نمایش اور دلکشی تو ضرور ہے لیکن ان میں ہمارے اسلاف کی سادگی اور حسن سیرت سراسر مفقود ہے۔

بظاہر یہ خیال کیا جائیگا کہ ان امور کا تذکرہ میرے موضوع بحث سے خارج ہے۔ لیکن اسر کو کیا کیا جائے کہ حصول آزادی کے بعد ہماری پیشتر اقوام انہی لوازمات حیات سے چشم پوشی کے باعث حقیقی عظمت وشرافت کی تجلیوں سے محروم ہوچکی ہیں پس مبارک ہیں وہ اخلاف جو گذشتگان کی فرو گذاشتوں سے عبرت وبصیرت کا سبق حاصل کرنے کی صلاحیت اور ہمت رکھتے ہیں یہ داروئے تلخ اس لئے پیش کیگئی ہے کہ ہم ان مشاہدوں پر عمیق نظر سے غور وفکر کریں اور دکن کی پرعظمت وجلال سرزمین پر جس کی آزادی کو بافضال الٰہی دو سو پانچ برس گزرچکے ہیں ہمیشہ کیلئے ہم اپنی راستی ودانائی کا ایسا اعلیٰ اور زبردست نشان فتحمندی نصب کردیں جو ہمارے اخلاق حمیدہ کا لوا افتخار اور راستی کردار کا طغرائے امتیاز ہو

جرس

(از جناب شبیر حسن خاں صاحب جوش ملیح آبادی رکن دار الترجمہ)

بیخبر چونک کہ ہیں عشق کے ساماں اب تک
درد کی جنبش سے بازار ہیں زنداں اب تک

محشر انگیز ہے وہ قاتل خونریز ہنوز
محشر خلق ہے وہ آفت دوراں اب تک

نجد کے خاروں میں ہے آج بھی لیلی کی صدا
مصر کی خاک میں ہے شعلۂ کنعاں اب تک

رہزن خلق ہے وہ نرگس مستانہ ہنوز
پیچ در پیچ ہے وہ زلف پریشاں اب تک

مہر کیوں ہے تری آنکھوں پہ گراں خوابی کی
حسن ہے منتظر دیدۂ حیراں اب تک

ذوق باقی نہیں کیوں بادیہ پیمائی کا
ذرہ ذرہ ہے بیاباں میں غزلخواں اب تک

کسقدر سُن ہے ترا قلب کہ احساس نہیں
چھیڑتا ہے کوئی تاروں کو رگ جاں اب تک

کیوں بناتا نہیں شایان جواہر دستار
دیکھ ہر کان میں ہیں لعل بدخشاں اب تک

آہ تو بحر محبت کا شناور نہ رہا
ورنہ ہر موج میں ہیں گوہر غلطاں اب تک

اب بھی چلتی ہے ہوا صبح کو ٹھنڈی ٹھنڈی
مسکراتے ہیں اسی طرح گلستاں اب تک

درد کیوں چھوٹ گیا جوش سحر خیزی کا
روز لاتی ہے صبا نامۂ جاناں اب تک

اصول آزادی

(آئرلینڈ کے مشہور محب وطن مکسوینی کے چند خیالات)

از جناب سید معین الدین صاحب قریشی ایم۔ اے (عثمانیہ) سابق مدیر مجلۂ عثمانیہ

روحانی شکست و اطاعت کی تلافی کوئی جسمانی فتح و کامرانی نہیں کر سکتی۔ جس گروہ کو اس سے انکار ہو میں اس کا کسی طرح طرفدار نہیں۔ حق آزادی کا صحیح مفہوم دراصل ایک روحانی ضرورت رہتی ہے۔ جس کا مادی پہلو دوسرے درجہ پر قابل غور ہے۔ ایک انسان جو کشمکش حیات میں مبتلا ہے نت نئی جسمانی اور روحانی قوتوں سے بہرہ اندوز ہوتا ہے۔ انفرادی اور اجتماعی دونوں اغراض کیلئے ضروری ہے کہ اس کو ان قوتوں کی پرورش اور اپنی ذات کو موزوں ترین ثابت کرنیکا کامل موقع دیا جائے۔ اور یہ بغیر آزادی کے کسی طرح ممکن نہیں۔ ایک آزاد سلطنت اس کی مکمل تربیت نفس کا فطری ماحول ہے اور پابہ زنجیر سلطنت میں معاملہ بالکل برعکس ہوتا ہے۔ جب ایک ملک کسی پرائے ملک پر قابض و متصرف رہتا ہے تو یہ غریب مادی اور اخلاقی نقصانات کا شکار ہوتا رہتا ہے۔ مادی اعتبار سے اس لئے کہ وہ ہر طرح سے غارتگری کا جولانگاہ بنا رہتا ہے اور اخلاقی لحاظ سے اس طرح کہ حکمران قوم حصول طاقت کی خاطر چند نہایت ہی مضر اور زہریلے اثرات کو مسلط کر دیتی ہے اسی سے یہ معمولی منضبط ہوتا ہے کہ جائز طاقت شہریوں کے محاسن کو چمکاتی ہے اور غاصب قوت صرف انکی برائیوں کو پیدا کرتی ہے بدی کا علم درحقیقت جنگ کا پیغام ہے۔ اس وقت اہل ملک کو سوائے خم ٹھونکنے کے کوئی اور چارہ کار نہیں پھر رزم و پیکار سے کسی قسم کا سمجھوتا ممکن ہی نہیں۔

شخصی اور قومی دونوں اعتبارات سے ہم ارتقاء نفس کیلئے جد و جہد کرتے ہیں اگر ہم ترقی نہ کر سکیں تو پچھلے پاؤں ہمیں تنزل ضرور کرنا پڑیگا۔ یہ حیات و ممات کا مسئلہ اور روحانی نجات کا زینہ ہے۔ اگر تمام قوم آگے بڑھنے کیلئے تیار ہے تو ہم خوش ہیں کہ ہم کامیاب ہوگئے۔ اور اگر گنتی کے چند ہی افراد اس کے علم بردار ہیں تو انھیں نسبتہ مستقل مزاج رہنا چاہئے کہ وہ تعداد میں کم ہیں۔ وہ ایک ذاتی حق کیلئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ کسی جماعت کی اکثریت کو اس کے ترک کرنے کا اجارہ یا اسکو پامال ڈالنے کی کوئی قوت حاصل نہیں استبداد اس حق کے محافظین کو جلاوطن کر سکتا ہے اور اگر چاہے تو ان کو تیغ کے گھاٹ بھی اتار سکتا ہے۔ لیکن اصلی چیز ناقابل فنا ہے جس کی حفاظت کیلئے نہ صاحبان شمشیر کی ضرورت ہے اور نہ آتش بیان مقررین اور ارباب دانش کی۔ صرف ایک انسان اس کے انکشاف کیلئے کافی ہے اور چونکہ وہ اکلوتا انسان کبھی ناکام نہیں رہا۔ اس لئے وہ چیز بھی موت سے دوچار نہیں ہوئی۔ آزادی کی غائت تمام افراد کیلئے مسرت و نجات کا حاصل کرنا اور خود غرضانہ طریق کار سے الگ ہو کر دنیا کو نسل انسانی کی خوبصورت اور خوشگوار خوابگاہ بنانا ہے کوئی سلطنت کوئی جمہوریہ اور کوئی تبادلہ خیال ہم کو از سر نو زندہ نہیں کر سکتا۔ حریت آزادی کا حقیقی فرمان ہمارے پاکیزہ نفس اور نثار نصب العین ہی میں پوشیدہ ہے۔

اخلاقی اعتبار سے صاحب طاقت وہ انسان ہے جو نتائج سے بے نیاز ہو کر اس چیز کی حمایت کیلئے کمربستہ ہو جائے جس کو وہ جائز اور ضروری خیال کرتا ہے۔ اس کا پہلا اصول یہ ہوتا ہے کہ ایک سچی بات اچھی بھی ہوتی ہے اور ایک اچھی بات سچی۔ جائز استعمال سے کبھی برے نتائج نہیں پیدا ہو سکتے۔ وہ اس یقین کیساتھ

اٹھ کھڑا ہوتا ہے اس کی کامیابی دنیا کو پاک اور حسین بنا دیگی۔ مصیبت زدوں کی آسائش، پابندان سلاسل کی رہائی، خفتگان مرقد کے احترام اور آئندہ نسل کی فلاح و بہبود کیلئے وہ ہر مصیبت کو جھیلتا اور ہر ابتلا کو برداشت کرتا رہتا ہے۔ ایک مسلح انسان ایک جماعت کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اسی طرح ایک چھوٹی سی فوج ایک جرار لشکر کے سامنے نہیں آسکتی۔ لیکن دنیا کی کل فوجی طاقت ایک سچے انسان کے حقیقی جوش کو نہیں دبا سکتی حقیقی سرباز حریت دل کھول کر لڑنے میں کبھی نہیں جھجکیگا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اسی کے دست و بازو سے آزادی حاصل ہوسکتی ہے وہ اپنے دشمن کی زندگی کا درپے نہیں ہوتا بلکہ اس کی بدکاریوں کا درپے ہوتا ہے ان کی بیخ کنی سے وہ نہ صرف خود آزادی حاصل کرتا ہے بلکہ اپنے دشمن کو بھی سعادت ابدی کے حاصل کرنیکا موقع دیتا ہے۔

موجودہ اور آنے والی جنگ کی ہر صورت گری میں چیرہ دستی کے بجائے مضبوط اور قوی دل کی ضرورت ہے۔ جوش کی کارفرمائی زندگی کیلئے لازمی ہے۔ لیکن اس کو دماغ کی قلمرو سے علحدہ نہیں کیا جاسکتا اور اسی صورت میں وہ ایک اعلیٰ قسم کا جوش کہلایا جاسکتا ہے۔ جس کی تربیت ہمارا مقصد اعظم ہونا چاہئے۔ اسی سے ہر شخص کی روح ایک ناقابل تسخیر قلعہ کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ فوجیں ناکام رہ سکتی ہیں لیکن اس کے سیلاب کو کوئی نہیں روک سکتا جس جماعت کو جوش ابھارتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس جماعت کے پرزے اڑجائیں لیکن وہ جوش دوسرے اجسام میں منتقل ہوکر دہکتا ہوا انگارہ بن جاتا ہے تو پھر اسے یاران وطن! نغمہ مسرت کو بلند کرنا کہ ہماری روحیں اب بھی ہمارے قبضہ میں ہیں۔ دور جدید کی ذلت و رسوائی نے قدیم آتش خاموش سے ایک چنگاری ہمارے دلوں میں پیدا کردی ہے پرانی گرمی ہنگامہ پھر اپنا تماشا دکھانے پر تلی ہوئی نظر آتی ہے۔ تو کیا ہم اپنے حقوق کی حفاظت اور آزادی کے حصول کیلئے جہاد پر آمادہ نہیں ہونگے؟

ہمارے دشمن درحقیقت ہمارے بھائی ہیں جن سے ہم اب بیگانہ ہوگئے ہیں۔ اگر [illegible] کو از سر نو زندہ کرنا ہے تو ہمیں اس اگلی مواخات کو تازہ کرکے اندرونی اتحاد قائم کرنا پڑے گا۔

اور اگر دنیا کا احیا ہمارا اصل مقصود ہے تو عالمگیر اتحاد ناگزیر ہے جس کی بنیاد حکومتی تفاخر پر نہیں بلکہ دلوں کے اتحاد پر رکھی جائے اس عظیم الشان مقصد کیلئے ہر فرد اور ہر قوم پر چند فرائض عائد کئے گئے ہیں جن کی بجا آوری کے لئے نسل انسانی کے عام مبداء، ان کے مدرجہ مشترک اور اہل جہاں کے باہمی اغراض کا مطالعہ ضروری ہے تاکہ ہم اپنے فلسفہ حیات کو مربوط و مرتب کرسکیں۔

جب اتحاد مکمل ہوجائیگا تو آزادی کامل طور پر ہماری دسترس میں آجائے گی۔

اس لئے ہم کو سب سے پہلے انفرادی صبر و تحمل اور جرات و ارادہ کی پرورش و تربیت کرنی چاہئے۔ یہ خیال اگر اچھی طرح ذہن نشین ہوگیا تو سمجھئے کہ ہمارا اصلی کام بھی شروع ہوگیا۔

بعض مقامات پر یہ خطرناک خیال مسلط ہوگیا ہے کہ ہم زمانہ مستقبل میں جنگ آزادی کیلئے طلب کئے جائیں گے۔ فی الحال سوائے اس کے ہمارا کوئی کام نہیں کہ انتظار و مشاہدہ کرتے رہیں۔ لیکن یہ ایک بڑی غلطی ہے ہمارا فریضہ ہے کہ اس آنیوالی جنگ کیلئے اچھی طرح سے اپنے آپ کو تیار کریں اور اپنی قوتوں کو خوب تپالیں۔ اس کے علاوہ ایک اور غلطی بھی عام طور پر رائج ہوچکی ہے کہ ہمارا قومی کام اور کاموں سے کچھ جداگانہ ہے۔ تمدنی اور مذہبی معاملات کو اس سے سروکار ہی نہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی فرصت سے چند گھنٹوں کو قومی کام کیلئے صرف کرتے ہیں اور باقی تمام دن اس طرح پھرتے ہیں کہ گویا ہماری کوئی قوم ہی دنیا میں موجود نہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ دوپہر کے روپ کو صبح کی دلفریبی اور شام کی رنگینی سے ایک قدرتی لگاؤ ہے۔ اسی طرح انسان جب ماحول میں بھی اپنے آپ کو پائے یہ ضرور محسوس کرے کہ اس کے اعمال دوسرے ماحولوں سے بھی متعلق و منسلک ہیں۔ کوئی ایک ماحول میں دیانت دار اور دوسرے ماحول میں بددیانت نہیں رہ سکتا ایک سچے شہری کو اپنے اعمال میں مطابقت پیدا کرنی چاہئے۔ اس کا فریضہ ہے کہ قومی نجات اور آزادی کیلئے وہ اپنی خانگی زندگی کے بنیادی محاسن کو ترقی دے اور انفرادی کریکٹر کو مستحکم کرے۔ اس مقصد کی تکمیل میں اس کو ایسی چیزوں سے بھی سابقہ پڑیگا جو بظاہر قومی نقطہ نظر سے غیر متعلق اور بے نتیجہ معلوم ہوں۔ لیکن اس کو یہ ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ شخصی تنظیم کا ہر فعل اس انجان سرچشمہ کا معاون ہے جہاں سے شریف اور لطیف قوتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔

حضرت مغفرت مآب نواب نظام الملک آصفجاہ بہادر
کے
ماثر و محاسن اور انکے دربار کے علمی حالات

نوشتہ
مولوی حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری ماہر علوم آثار قدیمہ

نواب آصف جاہ کے زہد و اتقا اور بذل و سخا کا شہرہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا علم و فضل میں یکتائے روزگار تھے عربی فارسی اردو کے علاوہ ترکی زبان سے بھی آپ کو خوب واقفیت تھی اور اس میں نہایت صفائی اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ گفتگو کیا کرتے تھے۔

آپ کو علم و فن سے خاص دلچسپی تھی آپ کے دربار میں علما و فقرا اور شعرا کا ہمیشہ مجمع رہا کرتا تھا۔ عرب عراق، خراسان، ماوراء النہر اور اور ہندوستان کے علما و سادات آپ کی قدر دانیوں کا شہرہ سنکر آتے اور اپنی اپنی قسمت کے موافق سرفراز ہوا کرتے تھے۔

دفتر صدارت کی یادداشتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپنے تین لاکھ روپیہ ماہانہ کے یومیئے ارباب استحقاق کے لئے مقرر فرمائے تھے ایک لاکھ سالانہ حاجیوں کو زاد راہ کے لئے دیا جاتا تھا وہ عطیات اور انعامات اس کے علاوہ تھی جو عیدین، ایام جشن، فتح وغیرہ وزی، اور دیگر تقاریب میں ارباب حاجت کو عطا ہوا کرتے تھے۔

آپنے مختلف مشاغل کے لئے اوقات تقسیم کر رکھے تھے روزانہ صبح سے دوپہر تک مہام سلطنت میں مصروف رہتے اور تمام امور خواہ جزئی ہوں یا کلی بہ نفس نفیس انجام دیا کرتے تھے نماز ظہر کے بعد کلام الٰہی کی تلاوت اور فقہ کی سماعت کے لئے وقت مقرر تھا عصر سے مغرب تک علما اور شعرا جمع ہوا کرتے تھے رات کو سادات و مشائخین سے ملاقات رہا کرتی تھی

نواب صاحب کو شعر و سخن سے خاص رغبت تھی خود بھی خوب شعر کہتے تھے اور شیخ عبدالقادر بیدل سے اصلاح لیا کرتے تھے ابتدا میں شاکر تخلص تھا بعد میں تبدیل کر کے آصف اختیار فرمایا آپکے منظومات سے اس وقت دو دیوان موجود ہیں جنکی ضخامت کم و بیش دو ہزار صفحات ہوگی ۱۳۰۹ھ میں نواب شرف جنگ بہادر کے اہتمام سے مطبع رکاب سعادت میں اس کی طباعت ہوئی ہے۔

شعر و سخن کی جب صحبت گرم ہوتی تو نواب صاحب بیت یا مصرعہ موزون فرماتے اور اس پر حاضرین فی البدیہہ طبع آزمائی کیا کرتے تھے ایک دفعہ نواب رگاہ قلی خاں نے ایک غزل فی البدیہہ موزون کی تھی جس کی ایک بیت یہ ہے

علم آصفا این غزل تازہ کرد ؛ کارہا کار فرما میکند

نواب صاحب کو تصنیف و تالیف کا بھی شوق تھا آپنے حضرت شاہ نظام الدین ولی اور ان کے نامور فرزند شاہ فخر الدین فخر جہاں کے حالات و مناقب پر دو مستقل کتابیں لکھی ہیں جن کے نام احسن الشمائل اور مناقب فخریہ ہیں یہ کتابیں اس وقت نایاب ہیں لیکن مفتی غلام صاحب لاہوری نے انھیں دیکھا ہے اور اپنی کتاب خزینۃ الاصفیا میں ان سے اکثر مضامین نقل اور اخذ کئے ہیں۔

جس زمانہ میں نواب صاحب دہلی میں مہمات وزارت انجام دیرہے تھے تو میر عبدالجلیل بلگرامی نے نواب کی مدح میں ایک قصیدہ انشاد کیا اور نواب امین الدولہ وقایع نویس نے اسے ملاحظہ میں گزرانا تو میر موصوف کو دربار میں طلب کرکے خلعت اور دس ہزار روپیہ نقد صلہ میں عطا فرمائے۔

جس زمانہ میں نواب صاحب دکن کی جانب تشریف لارہے تھے انھیں دنوں میر غلام علی آزاد

بھی زیارت بیت اللہ کا ارادہ کر کے وطن سے نکلے اثنا راہ میں نواب صاحب سے ملاقات ہوئی مولانا نے حسب ذیل رباعی پیش کی اور زاد راہ کے لئے اعانت کے خواہاں ہوئے۔

اے حامیٔ دین محیط جود و احسان
حق داد ترا خطاب آصف شایاں
او تخت بدرگاہ سلیمان آورد
تو آل نبی را بہ در کعبہ رساں

رباعی کو سن کر نواب صاحب بہت محظوظ ہوئے اور مولانا کو آمد و رفت کے لئے اخراجات سرفراز فرمائے۔

نواب صاحب کے دربار میں اکثر ارباب فضل و کمال جمع تھے۔ اور انھیں آپ نے بڑے بڑے عہدوں پر مامور فرمایا تھا۔

میر محمد ہاشم جرأت دربار کے میر منشی تھے نواب صاحب نے انھیں معز الدولہ موسی خاں کا خطاب دیا تھا۔ اور اپنے عہد کا ابوالفضل کہا کرتے تھے موسی خاں کو نثر نویسی کے علاوہ شعر و سخن میں بھی قدرت حاصل تھی ان کا دیوان اور انشار دونوں بہت مشہور ہیں انشا میں خانگی خطوط کے علاوہ نواب آصفجاہ کے سرکاری مراسلات بھی جمع کیے ہیں ۱۱۵۸ھ میں ان کا انتقال ہوا ہے مولانا آزاد بلگرامی نے حسب ذیل تاریخ وفات لکھی ہے۔

موسی خاں زکلک گوہر بار۔ آبرو داد شعر و انشا را
گفت تاریخ رحلتش۔ آزاد۔ کرد جرأت وداع دنیا را

نواب صاحب کے میر منشیوں میں محمد امین اور مرزا خاں پر ساکھی قابل ذکر ہیں محمد امین عرصہ تک نواب صاحب کے یہاں رہنے کے بعد ارکاٹ چلے گئے اور وہاں نواب سعادت اللہ خاں ناظم کرناٹک کی ملازمت کر لی ان کی مجمع الانشاد اور گلشن سعادت مشہور و متداول کتابیں ہیں

میرزا خاں سید علی ہمدانی کی اولاد سے تھے حیدرآباد میں انکی ولادت ہوئی ہے۔ نواب صاحب نے انکو اخیر زمانہ میں اپنا میر منشی بنالیا تھا۔ نادر شاہ کی یورش کے وقت نواب صاحب کے ہمراہ انھوں نے بھی شاہ جہاں آباد کی سیاحت کی تھی شعر خوب کہا کرتے تھے ۱۱۷۴ھ میں انکا انتقال ہوا ہے۔

صمصام الدولہ اور خافی خاں نواب صاحب کے امراے دربار سے تھے یہ دونوں عہد مغلیہ کے مشہور مورخ ہیں صمصام الدولہ شاہنواز خاں نے تاریخ میں دو کتابیں لکھی ہیں ایک ماثر الامرا جس میں امراے تموریہ کے حالات ہیں دوسری بہارستان سخن اس میں شعراے عجم کا تذکرہ ہے پہلی کتاب نہایت مشہور ہے اور تین ضخیم جلدوں میں ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کی طرف سے طبع ہو کر شایع ہوی ہے ان کے علاوہ صمصام الدولہ نے محمد علی برہانپوری سے دنیا کی ایک مبسوط تاریخ لکھوائی ہے اس کا نام مراۃ الصفا ہے اور اس کے متعدد نسخے یورپ کے بڑے بڑے کتب خانوں میں موجود ہیں۔

خافی خاں اپنی تاریخ منتخب اللباب کی وجہ سے غیر معمولی شہرت رکھتا ہے اور اس کی یہ تاریخ سلاطین مغلیہ کے اخیر عہد کی نسبت بہترین اور اکمل ترین کتاب سمجھی جاتی ہے۔

نواب آصفجاہ اور ان کے جانشینوں کے عہد میں اس نے سلطنت کی بہت سی خدمات انجام دی ہیں اور عرصہ دراز تک شش صوبہ جات دکن کی خدمت دیوانی پر بھی مامور رہا ہے۔

مولانا آزاد بلگرامی جب حج بیت اللہ سے واپس ہوے تو جہاز سے اتر کر سورت سے دکن چلے آے اور نواب صاحب کے لطف و کرم کے باعث اورنگ آباد کی سکونت اختیار کی۔ نواب صاحب انکی بیحد تعظیم و تکریم کیا کرتے تھے اور ہفتہ میں دو یا تین مرتبہ بعد مغرب آپ باریاب ہوا کرتے تھے۔

دکن

ازجناب ابوالکلام بدرالدین صاحب بدر متعلم ایم، بی، بی ایس۔

ہند کی تو اے دکن ابھری ہوئی روشن جبیں
دلفریب ایسی بنائی حق نے تیری سرزمیں

ہے فزوں تر رتبہ تیرے تخت کا افلاک سے
بجلیاں اٹھکر نقیں چمکی تیری خاک پاک سے

تیری مٹی سونگھتا تھا عارفِ گیسو دراز ؛
تیرے سایہ میں بڑھا ٹیپو شہ قاتل نواز

جانمن ! باغ تمنائے علاؤالدیں ہے تو ؛
ہے غضب تیری کشش روشن چراغ صبح ہے تو

بھاگئی تیری ہوا جب آسمان پیر کو
گود میں تیری سلایا شاہ عالمگیر کو

چرخ نے بھولے نہیں ماضی کے افسانے ہنوز
شاہنامہ پڑھ رہے ہیں تیرے ویرانے ہنوز

سربسر خاموش نغمہ تیرے میدانوں میں ہے
شاعری کی جان گویا تیرے بیابانوں میں ہے

اشک بھر لاتا ہوں جاکر آبشاروں میں ترے
ہوں قفس میں خوش کہ ہے یہ سبزہ زاروں میں ترے

مادر اردو تیرا دم ابر نیسان علوم
وہ افق پر تابش خورشید سلطان العلوم

مہر بڑھتا ہے تیری روشن جبیں کو چوم کر ؛
چھاگئیں تجھ پر گھٹائیں رحمتوں کی جھوم کر ؛

کھب گئی اغیار کی آنکھوں میں زرخیزی تیری
رونق خلد بریں شان دلاویزی تیری

تیرے جنگل ہیں معطر وادیاں سرشار ہیں ؛
ندیاں سیماب گوں تیرے گلے کا ہار ہیں

بول میٹھے بھر رہے ہیں تیرے چوب و تار میں
بانسری بجتی ہے بن کی روز و شب کہسار میں

تیری سردی میں بڑھے گرمی دل بیتاب کی
وہ حرارت معتدل خورشید عالمتاب کی

روپ وہ ساون کا دلکش دور کے کہسار پر ،
دھوپ کی نکلی سواری ابر کے رہوار پر

سادگی دوشیزہ صورت تیرے کاشانوں میں ہے
حسن قدرت کی ضیاء تیرے شبستانوں میں ہے

صبح دم صل علیٰ اٹھنا گلوں کا شادکام
سبزۂ شاداب پر بادبہاری کا خرام

چاندنی راتیں تری پرکیف اور ٹھنڈی ہوا
سیرگاہ حضرت باری نبی تیری فضا

شب کی تاریکی میں وہ حشر جنون پرسکوں ،
اوڑھنی سی چاند تاروں کی وہ سر پہ نیلگوں

الغرض اے جان جاں تیری ادائیں گلفروش
در ثناء تو لذت خون ما آمد بہ جوش

چونکہ بودی از ازل تو ہمچنیں تابندہ باش ،
اے دکن آزاد باش و شاد باش و زندہ باش

ممالک محروسہ سرکار عالی میں سائنس کی تعلیم و ترقی

از جناب مولوی عبدالرحمٰن خان صاحب بی اے۔ بی ایس سی صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ

اس مضمون سے ہمارا یہ مقصد ہے کہ اردو داں دنیا کو مطلع کریں کہ ممالک محروسہ میں جہاں اس وقت ہر علم و فن کی تعلیم و ترقی پر لاکھوں روپئے سالانہ خرچ ہوتے ہیں خصوصیت کیساتھ سائنس کی تعلیم کو کس حد تک ترقی نصیب ہوئی ہے اور اس کا مستقبل حیدرآباد میں کیا ہے دس پندرہ سال پہلے کی حالت سے اب کی حالت کا اگر مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ترقی اس سرعت اور جامعیت کے ساتھ ہوئی ہے کہ اس کا اندازہ کرنا سخت مشکل کام ہے ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ لوگ سائنس کو مذہب کا قاتل سمجھ کر اس سے اپنی اولاد کو محفوظ و مبرا رکھنے کی کوشش کرتے تھے جب اس کا انکشاف ہوا کہ سائنس کی حقیقت کیا ہے اور سچے مذہب کی سائنس سے تائید ہی ہوتی ہے نہ کہ تردید تو بعض لوگ اس کی تحصیل میں ڈرتے ڈرتے قدم آگے بڑھانے لگے تھوڑی دور جانیکے بعد معلوم ہوا کہ یہ ایک آسان علم نہیں ہے آرام کرسی پر لیٹ کر یا محض کتب کی اوراق گردانی سے اس پر دسترس حاصل نہیں ہوسکتا تو ایک طبقہ ایسے صاحب رائے دانایوں کا بھی پیدا ہوا جنھوں نے تصفیہ کرلیا کہ سائنس کیلئے ایک خاص قسم کے دماغ کی ضرورت ہے اس لغو خیال کی چند ہی دنوں میں تردید ہوگئی جب کہ سائنس کے شائقین کو احساس ہوا کہ یہ علم یا فن محض کتاب کے مطالعہ سے حاصل نہیں ہوسکتا بلکہ اس کے لئے عمل یعنے تجربہ کی شدید ضرورت ہے عملی تعلیم کا اگر انتظام ہو جائے تو کم از کم پچاس فی صد طالب علم نہ صرف اس کو دلچسپ پاسکتے ہیں بلکہ اس کو اچھی طرح سمجھ بھی سکتے ہیں۔

حیدرآباد میں ایک عرصہ سے سائنس مدرسوں اور کالجوں کے نصاب تعلیم میں داخل ہے لیکن اسکو ہمارے ملک میں عام قبولیت اس وقت نصیب ہوئی جب کہ سرکار نے اس امر کو تسلیم کرلیا کہ سائنس کی تعلیم پر سال بالالتزام ایک معتدبہ رقم کے صرفہ کی ضرورت ہے اور اس کے لئے خاص عمارات کا بنانا بھی ضروری ہے پہلے ہائی اسکولوں اور مدارس فوقانیہ کے تجربہ خانہ درست ہوتے آئے اور بعد کو کالجوں میں باضابطہ عملی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام کیا گیا اس کے ساتھ ساتھ صنعت و حرفت سے متعلق بھی معمل اور تجربہ خانہ تیار ہونے لگے اور اب بلاخوف و تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ جس شعبہ سائنس کی جس حد تک تعلیم دیجاتی ہے وہ باقاعدہ اور صحیح اصول پر ہوتی ہے اس علمی ترقی پر سرکار عالی کو مبارکباد دی جانی چاہئے کہ اس قدر قلیل عرصہ میں ایک اہم شعبہ علم کو ایسی عام قبولیت نصیب ہوئی۔

(۲)

جامعہ عثمانیہ کے افتتاح سے ملک کے ہر گوشہ میں سائنس کی تعلیم جاری ہوگئی ہے اور چونکہ معمولی نصاب کی اکثر کتابیں اردو میں ترجمہ ہوچکی ہیں اس لئے ہر اردو داں کو سائنس سے کم از کم شناسائی حاصل کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ انگریزی سے ناواقف اہل حرفہ کے لئے بھی اپنے فن میں علمی ذرایع سے ترقی کرنے کی امید ہوسکتی ہے۔ عنقریب طب و انجنیرنگ اور ٹکنالوجی کی کتابیں بھی ترجمہ ہوکر شایع ہوجائینگی جن سے جدت پسند جویائے ترقی ہنرمندوں کو بے حد فائدہ ہوگا۔

سائنس کیلئے تجربہ خانہ اور کتب خانہ کی ضرورت ہے تجربہ خانہ ایسا ہونا چاہئے جہاں سامان نمائش کے طور پر رکھا نہ رہے بلکہ لوگ اس کو استعمال کریں اور سچا استعمال کریں اس کے لئے ماہر اساتذہ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ کتب خانہ میں ایسی کتابیں ہونی چاہئیں جن کو لوگ پڑھ سکیں اور پڑھ کر ان سے فائدہ اٹھا سکیں یورپ میں زبانوں میں تو سائنس کی کتابوں کے انبار موجود ہیں ہزاروں لاکھوں کتب مختلف سائنٹفک مضامین پر لکھی ہیں اور اکثر و بیشتر کتب خانوں میں روزانہ عوام کے استعمال میں آتی ہیں ہمارے ملک میں بھی بعض انگریزی کتب خانہ اچھے ہیں لیکن عوام ان سے کافی استفادہ نہیں کرسکتے دیسی زبانوں میں لکھی ہوئی سائنس کی کتابیں مہیا ہوتی ہیں اور کتب خانوں

ہیں لوگ ان کا بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ اس وجہ سے بھی سائنس کے خواہش مندوں کی تعداد میں روز افزوں ترقی ہو رہی ہے۔

بحمد للہ اس وقت ملک میں ایک بڑی جماعت مبادی سائنس سے واقف نوجوانوں کی موجود ہے جو اگر ٹھیک راستہ پر لگائے جائیں تو ملک کا نام ایجاد و انکشاف کی دنیا میں بھی روشن کر سکیں گے تعلیم سائنس کے باضابطہ عمارتیں تیار ہونے اور انجنیرنگ و ٹکنالوجی کے کالجوں کے آغاز کے ساتھ ملک کے ان ہونہار نوجوانوں کا طبقہ بتدریج اپنی کارگزاریوں سے ملک کا نام روشن کریگا اور سرکار کی فیاضی سے جو روپیہ سائنس کی تعلیم پر اب صرف ہو رہا ہے اس کے مفید نتائج جدید انکشافات اور ایجادات کی شکل میں ظاہر ہونگے۔

یہ تمام ترقیاں اعلیٰ حضرت سلطان العلوم میر عثمان علی خاں بہادر ظل سبحانی کے عہد ہمایون میں صورت پذیر ہوئی ہیں اور انشاء اللہ ہوتی رہینگی ہمیں قوی امید ہے کہ وہ دن کچھ دور نہیں جب کہ حیدرآباد بھی کلکتہ مدراس اور بمبئی وغیرہ کی طرح ہندوستان کے سر برآوردہ سائنٹفک تحقیقات و انکشاف کے مرکزوں میں شمار ہوگا آمین ثمہ آمین۔

حیدرآباد فرخندہ بنیاد

از مولوی سید محمد حسن صاحب بلگرامی سابق صدر محاسب سرکار عالی

اگر کوئی شخص ہندوستان کا وہ نقشہ اٹھاکر دیکھے جو ۱۸۵۲ء میں شائع ہوا تھا تو ایک ہی نظر میں معلوم ہو جائے گا کہ اٹھارہویں صدی کے آخر میں سرزمین ہند کی کیا حالت تھی ہندوستان کا وہ زرخیز حصہ جو جزیرہ نما کہلاتا ہے تقریباً اس کا نصف قطعہ وسط میں مشرق کی طرف ذرا ہٹا ہوا نیلگوں نظر آئے گا یہ نیلگوں حصہ خسرو دکن کا ملک تھا اور اسی اٹھارہویں صدی کے وسط میں یہ ملک صرف اتنا ہی نہ تھا بلکہ اس کی وسعت دریائے نربدا سے ٹرچناپلی اور مسلی پٹن سے بیجاپور تک پھیلی ہوئی تھی ایک فرانسیسی مورخ موسیو آرمہ کا بیان ہے کہ شاہ دکن کی حکومت شمال و جنوب میں برہان پور سے لیکر کیپ کاموورن تک اور مشرق میں سواحل دریا تک تھی ۱۷۵۹ء میں گورنمنٹ ہند کے ساتھ جو عہد نامہ ہوا اس کی رو سے مسلی پٹن اور دوسرے اضلاع سرکار عالی نے گورنمنٹ کے حوالہ کر دیئے بعد ازاں ۱۷۶۶ء کے معاہدہ کی رو سے شمالی سرکاریں نکل گئیں ۱۷۸۸ء میں جب

وہاں کے جاگیردار نے رحلت کی تو سرکار گنٹور بھی حوالہ کر دی گئی اس قطع و برید کے بعد بھی جس قدر ملک خسرو دکن کے قبضہ میں باقی رہا اس کا رقبہ (۹۵۳۳۷) مربع میل تھا جو بلحاظ وسعت میسور و گوالیار ہر ایک سے چند اور مہاراجہ ہولکر کی ریاست اندور سے دہ چند بڑھا تھا بلکہ نیپال و کشمیر دونوں کے برابر جو اس زمانہ میں خود مختار ریاستیں مانی جاتی تھیں لیکن ۱۹۰۲ء میں صوبہ برار کی دائمی الحاق سے اس میں (۱۳۶۲۹) مربع میل کی اور کمی ہو گئی تاہم اب بھی یہ ریاست ابد مدت رقبہ میں احاطہ مدراس کے برابر ہے اگر اس میں سواحل کارومنڈل اور کوائم بٹور نکال دیے جائیں اور جزیرہ آئرلینڈ سے ڈھائی گنی ہے جس کے باغیانہ عمل نے دولت برطانیہ کو پریشان کر دیا تھا بلکہ انگلستان اور ویلز دونوں کے مقابلہ میں ۱½ گنی یہ وسیع خطہ ملک جس پر دو صدیوں

سے ہمارے آقائے ولی نعمت نظام الملک آصف جاہ کا پرچم سایہ فگن ہے سطح دریا سے (۱۲۵۰) فٹ بلند ہے گو کہیں کہیں اس کا ارتفاع سطح دریا سے (۲۵۰۰) فٹ بلکہ (۳۵۰۰) تک واقع ہوا ہے۔ یہ سارا ملک جغرافیائی حیثیت سے دو حصوں میں تقسیم ہے ایک حصہ مرہٹواری کہلاتا ہے اور دوسرا تلنگانہ اس ملک میں گوداوری اور کرشنا دو بڑے دریا بہتے ہیں جو اپنے بے شمار شعبوں اور شاخوں کے زرفشاں پانی سے سارے ملک کو سیراب کرتے ہیں یہ ملک عجیب نشیب و فراز قطعات زمین سے موضوع ہے کہیں پہاڑوں کا سلسلہ ہے، کہیں صحرا اور کہیں مسطح اراضی ہے غرضیکہ قدرت نے اس خطہ زمین میں عجیب دلفریب مناظر پھیلائے ہیں ایسی بوقلموں فضائیت اور کہیں نظر نہ آئے گی۔ ملک میں قدرتی جھیلیں تو نہیں ہیں مگر بعض مصنوعی تالاب

سکتے ہیں کہ قدرتی جھیلوں کو مات کر دیں تلنگانہ میں اس قسم کے تالاب ہزارہا ہیں جن سے کاشت کیلئے آبپاشی میں مدد ملتی ہے۔

یہ ملک معدنی دولت سے بھی مالامال ہے ایک طرف پہاڑ جواہرات کی جھولیاں بھرے کھڑے ہیں کہیں کوسوں تک معدن زغال پھیلا ہوا ہے جابجا لوہے کی بھی کانیں ہیں۔ خاص خاص معدن جو ابتک یہاں سے نکالے گئے ہیں وہ کوئلہ، سونا اور الماس ہیں۔ ابرک بھی بکثرت ہے اسوقت تک کوئلہ کی روزانہ برآمد کا اندازہ (۴۰۰۶) ٹن تک ہے معدن طلا کا رقبہ جو گورنمنٹ ہند کے جیالوجیکل سروے اور حیدرآباد دکن کے ماہرین فن طبقات الارض نے تشخیص کیا ہے وہ (۱۲۷۰) مربع میل ہے اگلے زمانہ میں یہاں کا فولاد دور دور جاتا تھا چنانچہ جگتیال، نرمل، ورنگل، بیل غوپ اور دوسرے مقامات فولاد کی برآمد کے لیے مشہور تھے یہیں کے فولاد سے خون آشام تلواریں اور خارا شگاف خنجر بنائے جاتے تھے یہاں کے صنائع گو دیگر بلاد ہند کی طرح یورپ کی حیرت انگیز کلوں کے بھینٹ چڑھ چکے ہیں مگر تاہم بعض صنعتیں جو باقی رہ گئی ہیں وہ اب بھی اپنی آپ نظیر ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ زمانہ کا قدم روز بروز ترقی پر ہے جو کل نہ تھا وہ آج ہے اور جو آج نہیں وہ کل ہو جائے گا جاپان کی تمدنی ترقی کا نظارہ چند سال ہوے دنیا نے دیکھ لیا کہ اس نے سارے یورپ کو ہلا ڈالا۔ ہمارے ملک کو اگرچہ اس قسم یا اس پایہ کی ترقی کا موقع نہیں ملا تاہم یہاں بھی اس گزشتہ نیم صدی میں جو ترقی ہوئی ہے اگر اسے دوسرے بلاد اسلام مثل ایران وغیرہ سے مقابلہ کر کے دیکھیں تو اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ غالبًا ناظرین واقف ہوں گے کہ پچاس برس پہلے یہاں کے ابد منزلتن کی کیا حالت تھی میں نے اکثر کہتے سنا ہے کہ شب کو کوئی تنہا گھر سے باہر نہ نکل سکتا تھا اور اگر بعض منچلوں کو شوق شب گردی گدگداتا بھی تھا تو وہ مسلح ہو کر اور بچی بن کے باہر نکلتے تھے اس لئے کہ ڈاکے پڑا کرتے تھے کشت و خون کی نوبت پہونچتی تھی جس قطعہ زمین میں آج باغ عام واقع ہے اور آج جو خاص و عام کا تفرج گاہ ہے۔ اور جہاں ہر سال ہم خسرو دکن کی سالگرہ مناتے ہیں اس عہد میں ڈاکوؤں کا جولانگاہ تھا۔ یا تو وہ حالت تھی یا آج ہم دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی تمام شب ہاتھ پر سونا اچھالتا پھرے تو کوئی ڈر نہیں عام تعلیمی حالت کی یہ کیفیت تھی کہ اگر کہیں سے کوئی تار آجاتا تھا تو اس کے لئے پڑھنے والے تلاش کئے جاتے تھے اور بدقت میسر آتے تھے یا آج گھر گھر علم کا چرچہ ہے (۳۸۵۵) مدارس کھلے ہیں جن میں (۲۰۱۶۰۳) طلبا تعلیم پا رہے ہیں اور در و دیوار سے

اطلب العلم من المهد الى اللحد

کی صدا گونج رہی ہے عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام نے شہر کو مرکز علم بنا دیا ہے عجب نہیں کہ میر و سودا پھر جنم لیں اور غالب کی روح یہ سنائے

عالم آئینہ راز ست نہ بازیچہ کفر
عارف آں بہ کہ باندیشہ زغوغا ماند
قدم یوسف اگر در رہ ایماں لغزد
بتے از دور نماید کہ برجا ماند

غرض کہ ایک دن آئے گا کہ ہم بلا مبالغہ یہ کہہ سکیں گے کہ :—

ہر کو چہ معلمے ستادہ ۔ ہر گاہ فلاطنے فتادہ
بازارگیان او خردمند ۔ ہم عقدہ کشا دہم سدبند
اوباش محیطی آفرینند ۔ اطفال شفا آئیں اند

کچھ عرصہ ہوا اس ملک کے انڈسٹریل پوٹنشیلز کے متعلق ایک رسالہ میری نظر سے گزرا اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے ہمارے ملک کی ترقی کے لئے کیا کچھ سامان مہیا کر رکھے ہیں صرف اس کی کسر ہے کہ انسان کا زیرک ہاتھ انھیں سنوار کر بازار عالم میں بھیج سکے انشاءاللہ تعالیٰ ایک دن آئے گا کہ یہاں ہر طرف دھن برستا نظر آئے گا اور ہم سونے کے محل اٹھائیں گے یہ سارے ترقی ملک کے سامان جو ہم دیکھ رہے ہیں کس کی بدولت ہے؟ یہ ہمارے آقائے ولی نعمت خسرو دکن کی حسن حکمرانی کے نتائج ہیں۔

تاجدار دکن

از مولوی علی شبیر صاحب سررشتہ دار انتظامی عدالت العالیہ

زینت افسر و اورنگ بڑھانے والے — فتنہ و شر کو زمانے سے مٹانیوالے

شعلۂ تیغ سے اعدا کو جلانے والے — جور و ایذا سے رعیت کو بچانیوالے

میر عثمان علیخاں شہ گردوں رفعت — قوم کی شان زمانے میں بڑھانیوالے

تابع شرع متین حامی دین و ملت — شان اسلام کی درزات بڑھانیوالے

تمنے اصلاحیں وہ فرمائیں کہ خوش ہیں سب لوگ — اس زمانے کے بھی اور اگلے زمانیوالے

رعب شاہی کا وہ بیٹھا ہے دلوں پر سکہ — سر اٹھا سکتے نہیں فتنہ اٹھانیوالے

عہد شہ میں کسی ظالم کو نہ ہنستے دیکھا — بیٹھے روتے ہیں غریبوں کو رلانیوالے

سینکڑوں کردیے سرکار نے نافذ اسکیم — عیش اڑانے لگے یاں خاک اڑانیوالے

ہوئے عمال ترقی سے شہا مالا مال — زر اٹھانے لگے تکلیف اٹھانیوالے

یومیہ منصب و تنخواہ و وظیفہ انعام — روز و شب پائے چلے جاتے ہیں پانیوالے

کرتے کرتے ترے احکام سخا کی تعمیل — تھک گئے اہل حساب اور خزانیوالے

داستانیں ہوئیں شاہان سلف کی تازہ — ذات والا سے۔ اولا کہونکے لٹانیوالے

فیض کے تم نے بہائے ہیں جہاں میں دریا — کیوں نہ ممنون تمہارے ہوں نہانیوالے

اہل مشرق ہوں کوئی یا کہ ہوں اہل مغرب — آپ کے دم کی ہیں سب خیر منانیوالے

مصر و شام و عرب و ہند و عجم میں شاہا — تم ہو کوس لمن الملک بجانیوالے

دام خیال

از جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب معتمد عدالت العالیہ

عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے" خیالات کے
ساتھ ساتھ دنیا کا رنگ بھی بدلتا رہتا ہے یہ تبدیلی
خیالات ہی کا نتیجہ ہے کہ پہلے جن چیزوں کو اچھا
سمجھتے تھے وہ اب بری ہو گئیں اور جن کو برا جانتے
تھے وہ اچھی موجودہ زمانہ کو گھٹی کا پہرا کہتے
ہیں۔ ہاں ہوگا بظاہر تو صحیح معلوم ہوتا ہے
روحانیت گھٹ گھٹ کر اب مادیت رہ گئی
ہے اور امراض دیوتاؤں کے رتبہ سے گھٹتے
گھٹتے کیڑے مکوڑے بن گئے ہیں ہر مرض
کا ایک الگ کیڑا ہے اور ہر آزار کا ایک جدا
جراثیمہ وہ دن دور نہیں کہ اخلاقی امراض
کے کیڑے بھی دریافت ہو جائیں خوردبینوں
سے دکھا دیے جائیں اور پچکاریوں کے ذریعہ
سے ان کو جسم میں داخل کر کے انسانوں کو
روحانیت کے تمام مدارج طے کرا کے عرش
پر پہونچا دیا جائے یا مادیت کے سب مراتب
سے گزار کر اسفل السافلین سے بھی کچھ
نیچے گرا دیا جائے۔

زمانہ کے اس انقلاب اور تحقیقات کے
اس سیلاب نے خیالات کو دماغ میں کچھ اس
طرح زیر و زبر کیا کہ راہ ترقی میں دنیا کی
موجودہ حالت اور زمانہ کی آئندہ کیفیت کا
اندازہ لگاتے لگاتے چشم ظاہر بین بند اور چشم
بصیرت وا ہو گئی۔

کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑے میدان میں کھڑا
ہوں اس کی وسعت کے کنارے پستی و بلندی خیالات
کی حدود سے جا ملتے ہیں۔ اس کا سبزہ اپنی تازگی
و طراوت سے گلزار ارم پر چشمک زن ہے اور اس کے
غنچہ و گل اپنی نزہت و خوشنمائی سے آسمان خیال
کی تاروں بھری رات کو شرماتے ہیں میدان کے
بیچوں بیچ شیشہ کا ایک نازک اور خوبصورت
گنبد ہے جو بلندی میں خیال انسانی کا ہمسایہ
اور صفائی میں دل مومن کا ہمپایہ ہے گنبد
میں یہ عجیب و غریب صفت ہے کہ اس کی بلندی
خیالات[1] کی بلندی اور پستی کے بموجب کسی کو
زیادہ اور کسی کو کم معلوم ہوتی ہے گنبد کی
چوٹی پر کلس کی جگہ اقبال کا ستارہ پڑا جھلمل
جھلمل[2] کر رہا ہے۔ یہ دیکھ کر اور حیرت ہوئی
کہ گنبد کا صرف ایک رخ ہے دوسرے پہلو کو
تراش کر کچھ اس طرح صاف کر دیا ہے کہ اس پر
پاؤں ٹکنا دشوار تو کیا محال ہے میں اس
صنعت عجیب اور تعمیر غریب کے نظارہ میں
محو تھا کہ کسی نے بائیں طرف[3] سے کہا کہ "کیا
دیکھ رہا ہے کچھ سمجھا بھی کہ یہ کیا طلسمات ہے
اس کو تماشہ نہ سمجھ یہ میدان عالم خیال ہے
اور یہ گنبد ترقی دنیا کا نقشہ" مڑ کر کیا دیکھتا
ہوں کہ ایک بزرگ خضر صورت منہ پر نکوئی نقاب
ڈالے ہوئے پہلو میں کھڑے ہیں میں نے پوچھا کہ
حضرت آپ کون اور یہاں میرے ساتھ
ساتھ کیسے آئے فرمایا تو کیا میں ہر ایک کے
ساتھ رہتا ہوں ہاں یہ ضرور ہے کہ میں سب کو
پہچانتا ہوں مگر بہت کم لوگ مجھے پہچانتے
ہیں سمجھنے والے مجھے رہبر صادق اور تجھ جیسے
ناسمجھ مجھے دل کہتے ہیں"، میں نے عرض کیا
"تو ہاں جناب یہ دنیا کا نقشہ ہے۔ مگر یہ تو
فرمایئے کہ کیونکہ ہم تو سنتے آئے ہیں کہ دنیا
گول ہے یہاں تو اس کی کچھ صورت ہی نئی
ہے ایک طرف گول ہے تو دوسری طرف سپاٹ
اچھا اب میں سمجھا پرانے[4] اور نئے خیالات کو ملا کر

---

[1] کیا انسان اور کیا انسان کے خیالات کسی کے نزدیک دنیا سب کچھ ہے اور کسی کے نزدیک کچھ بھی نہیں۔

[2] اقبال کی تابندگی کبھی ایک حالت پر نہیں رہتی۔

[3] دل بائیں طرف ہی ہوتا ہے۔

[4] پہلے زمین سطح سمجھتے تھے جدید تحقیقات نے اسکو گول کر دیا مزا یہ ہے کہ دونوں فریق اپنی اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں دیکھا کسی نے نہیں صرف عقلی دلائل سے ایکدوسرے کو دبانا چاہتے ہیں چند ہی روز ہوئے کہ جرمن کے ایک مشہور پروفیسر زمین کے کونوں کی تلاش میں نکلے ہیں ہماری رائے میں اگر آدھی زمین کو چپٹا اور آدھی کو گول مان لیا جائے

یہ کرۂ زمین تیار کیا ہے۔ میرے اس بے موقع مذاق پر ان کو غصہ آگیا۔ جھڑک کر بولے۔ سچ ہے جو دنیا میں اندھا رہا وہ آخرت میں بھی اندھا رہے گا بیوقوف یہ کرۂ ارض نہیں ہے یہ گنبد ہے انسانوں کے خیالات اور کوششوں کا نقشہ ہے قوموں کی ترقی و تنزل کا نقشہ ہے انسان کی پستی و بلندی کا نقشہ ہے۔ روحانیت اور مادہ پرستی کے مقابلہ کا نقشہ ہے غرض یہ سمجھ لے کہ خیر و شر کا نقشہ ہے سچ پوچھیے یوں کیا خاک سمجھائی دے گا۔ لے میری آنکھ سے دیکھ۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ میری آنکھوں میں خود بخود ایک عجیب قوت پیدا ہوگئی کیا دیکھتا ہوں کہ گنبد کی ڈھلان پر انسانوں کے گروہ کے گروہ اور انبوہ کے انبوہ چڑھے چلے جا رہے ہیں۔ کچھ چڑھتے ہیں کچھ پھسلتے ہیں کچھ آگے بڑھتے ہیں کچھ پیچھے ہٹتے ہیں [سلہ] بعض ایسے ہیں کہ بہت اونچے چڑھ گئے ہیں کچھ ایسے ہیں کہ بیچ ہی میں ہمت ہار بیٹھے ہیں بہت ایسے ہیں کہ نیچے ہی کھڑے کھڑے اچک رہے ہیں گنبد کے نچلے حصہ کو جو میں نے ذرا غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ کسی زمانہ میں اس گنبد کے اوپر بھی ایک گنبد تھا شروع دونوں ایک ہی جگہ سے ہوئے تھے مگر زمانہ کے ہاتھوں بڑا گنبد سارے کا سارا ٹوٹ کر صرف کنارے رہ گئے تھے۔ میں نے اپنے رہبر سے پوچھا کہ "اجی حضرت یہ اوپر والا گنبد کہاں گیا" فرمایا میاں اس دوسرے گنبد کی کچھ نہ پوچھو وہ گنبد تمہارے سامنے والے گنبد سے کہیں بڑا تھا۔ اس کا کلس گنبد گردوں سے گزر کر عرش کے کنگروں سے جا ملا تھا اس کا نام روحانیت کا گنبد تھا۔ دنیا والوں نے اس کی دیکھ بھال نہیں کی نتیجہ یہ ہوا کہ بیٹھ گیا۔ اب صرف مادہ پرستی کا گنبد حباب آسا رہ گیا ہے جب وہ نہ رہا تو یہ کیا رہے گا۔ بڑا گنبد فولاد کا تھا وہ اس شیشہ کے گنبد کو آسیب بلا سے بچاتا تھا۔ اب روحانیت کا سایہ دنیا سے اٹھ گیا کوئی دن جاتا ہے کہ مادہ پرستی کا یہ نازک اور پرشکوہ گنبد بھی حوادث زمانہ سے پانی کے بلبلے کی طرح بیٹھ جائے گا پہلے زمانہ کے لوگ دونوں گنبدوں پر ایک ساتھ چڑھتے اور دنیا کو دین سے جدا نہ کرتے تھے یہاں بھی اچھے رہتے وہاں بھی اچھے رہتے اب دنیا کے ایسے پیچھے پڑے ہیں کہ دین کو بالکل بھول گئے نتیجہ دیکھ لے۔ رفتہ رفتہ گنبد روحانیت تباہ ہوگیا کچھ کگریں رہ گئیں۔ وہ بھی آگے چل کر اس چھوٹی گنبد میں ملجاتی ہیں اب اگر کوئی روحانیت کا راستہ اختیار کرتا بھی ہے تو تھوڑے دنوں بعد دنیا داروں میں آملتا ہے غرض اب دنیا ہی دنیا رہ گئی سمجھے ہوئے ہیں کہ

[سلہ] عاقبت کی خبر خدا جانے
یاں تو آرام سے گزرتی ہے

میں نے پوچھا حضرت آخر اس نئے نمونہ کا گنبد بنانے میں بھی کوئی راز ہے" کہنے لگے۔

ہاں راز ہے اور بہت بڑا راز ہے بات یہ ہے کہ ہر قوم ستارۂ اقبال تک پہونچنے کی کوشش کرتی ہے جب [سلہ] انتہائی ترقی کو پہونچ جاتی ہے اور غرور کے نشہ میں بدمست ہو کر آنکھیں بند کر کے پاؤں آگے ڈالتی ہے تو تنزل کی ڈھلان پر سے لڑھکتی ہوئی گمنامی کے غار میں جا پڑتی ہے پھر اٹھتی ہے سنبھلتی ہے ترقی کے مدارج طے کرتی ہے اور پھر ادبار کی ذلتیں اٹھا کر رفتگان کی فہرست میں داخل ہو جاتی ہے" میں نے پوچھا "پیر و مرشد جب خدا نے انسان کو وہی دو ہاتھ دیے اور وہی دو پاؤں، وہی اعضا عنایت کیے اور وہی عقل تو پھر چڑھنے کے وقت ان کے آگے پیچھے رہنے کی کیا وجہ ہے" فرمایا مجھ سے کیا پوچھتا ہے تو خود دیکھ لے" اب جو میں نے غور کیا تو دیکھتا ہوں کہ کچھ لوگ دوسروں کی کندھوں پر کھڑے ہو کر اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں نیچے والے ہیں کہ بوجھ سے دبے جاتے ہیں اوپر والے ہیں کہ تعریفوں سے ان کی ہمت بڑھا رہے ہیں رقم سے ان کو مدد پہونچا رہے ہیں یہ پھر شکریہ کے ہاتھ سے اپنی پیشانیوں کا پسینہ پونچھتے ہیں اور ان بھاری بھاری لاشوں کو اٹھاتے ہیں میں نے اپنے رہبر سے کہا "حضرت یہ عجیب بے وقوف لوگ ہیں خود تو چڑھتے نہیں دوسروں کو چڑھا رہے ہیں۔ اگر ترقی ہی مقصود ہے تو خود ترقی کریں۔ یہ کیا کہ

سلہ ترقی یافتہ لوگ بہت کم ہیں اور غیر ترقی یافتہ قومیں بہت زیادہ۔

سلہ سچ ہے پستی ترقی کا اور ترقی پستی کا زینہ ہے ابتدائے آفرینش سے قومیں اسی اتار چڑھاؤ کی منزلیں طے کرتی رہی ہیں اور قیامت تک کرتی رہیں گی آج جو قوم بلندی پر ہے وہ کل گرے گی اور جو گری ہوئی ہے وہ بلند ہوگی۔

محنت تو کریں یہ اور فایدہ اٹھائیں دوسرے"
فرمایا۔ ہاں مادہ پرست دنیا میں یوں ہی ہوتا ہے
چھوٹے بڑوں کو بڑھاتے ہیں اور خود رفتار چلتے
ہیں البتہ روحانیت کے گنبد میں اس کے خلاف
عمل تھا جو خود اوپر چڑھ جاتا وہ نیچے والوں کا
ہاتھ پکڑ کر اوپر کھینچ لیتا اور اس طرح یہ زنجیر
کی زنجیر میدان رہبانیت میں آگے بڑھتی چلی
جاتی" وہ یہ کہہ ہی رہے تھے کہ میری نظر کچھ
اڑتے ہوئے پرچوں پر پڑی کیا دیکھتا ہوں
کہ ایک گروہ کا گروہ کتابیں بغل میں دبائے
گنبد پر چڑھا جا رہا ہے جہاں ذرا ان کا پاؤں
پھسلا کہ انہوں نے کتاب میں سے چند ورق
پھاڑ ہوا میں اڑا دئیے اور اس طرح کچھ
ہلکے ہو آگے قدم بڑھایا میں نے بڑے میاں
سے پوچھا" اجی جناب ان کو اپنے ساتھ کتابوں
کے یہ گٹھر لانے کی کیا ضرورت تھی۔ خالی
ہاتھ آتے ہوتے تو اس پھسلوان گنبد پر چڑھنے
میں آسانی ہوتی اور جب یہ کتابیں ان کو
ایسی ہی عزیز ہیں کہ یہاں لاد لاد کر لائے
ہیں تو اب ان کو پھاڑ پھاڑ کر پھینکنے کا کیا
مطلب ہے بوجھ کا بوجھ رہا اور کتابیں
ستیاناس ہو گئیں" ہنسکر کہنے لگے" یہ اہل قلم
اور اخبار نویسوں کا گروہ ہے ان کی ترقی کا
دارومدار انہی کاغذ کے پرزوں پر ہے اگر
ان کی تحریر کو لوگوں نے پسند کیا تو چڑھنے
میں ذرا سہارا دے دیا اگر کوئی حصہ ناپسند
ہوا تو انہوں نے اتنا حصہ پھاڑ اپنی رائے
کو بدل مضمون کا رخ کچھ اس طرح پھیر دیا
کہ ان کی ترقی کا باعث بن گیا جو اہل قلم
اس پر عمل نہیں کرتے وہ بے سہارا ہونے کی وجہ
سے گر رہے ہیں اور اپنی ہی کتابوں کے انبار
کے نیچے دبکر فنا ہو جاتے ہیں خیر یہ تو جو کچھ
ہیں وہ ہیں ذرا ان کے برابر والوں کو بھی
دیکھو" ادھر جو دیکھتا ہوں تو عجیب تماشا
ہے گروہ کے گروہ ہیں کہ گنبد پر چڑھتے بھی
جاتے ہیں اور لڑتے بھی جاتے ہیں سبحان اللہ
یہ چڑھائی دیکھئے اور ان کی یہ ابلہانہ حرکت
ملاحظہ کیجئے۔ ایسے چکنے گنبد پر چڑھنا خود ہی
کٹھن ہے بھلا یہ آپس کی دھینگا مشتی کیا
کچھ غضب نہ ڈھائے گی میں نے پوچھا۔
"اجی حضرت یہ کیا ہو رہا ہے" بولے" بود ہم تیغ
باہم ہمیشہ دشمن کا نقشہ ہے۔ ہاں ان میں
جو سمجھدار ہیں وہ ہاتھ دئیے ایک دوسرے
کو کھینچتے کھینچاتے بہت دور نکل گئے جو مقطع
صورتیں آپس میں دست و گریباں ہیں۔ یہ
توسول کے دینی پیشوا ہیں ان میں یہ خوبی
ہے کہ صرف دوسرے مذہب والوں ہی کو
نہیں نوچتے کھسوٹتے اپنے ہم مذہبوں کو
بھی لہولہان کیے دیتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں
جنہوں نے ترقی روحانیت کے گنبد سے
شروع کی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ مادیت کے
گنبد پر نکل آئے اور اپنے مصلّے سجادے
اور مرگ چھالے خانقاہوں کلیساؤں اور
شوالوں سے اٹھا کر کانگرس کی منڈیوں
تجارتی کانفرنسوں اور کمیشنوں کے اجلاسوں
پر لا بچھائے تعلیم کچھ پائی تھی لگے دوسرے
کام میں نتیجہ یہ ہوا کہ نہ ادھر کے رہے اور
نہ ادھر کے رہے یہی وہ لوگ ہیں جن کے
متعلق خسر الدنیا والآخرہ فرمایا گیا۔
میرے رہبر تو ان دنیوی دینداروں
کی مذمت میں لگے ہوئے تھے اور میں اس
گنبد کے چڑھنے والوں کے ایک دوسرے
گروہ کا تماشا دیکھنے میں مشغول تھا کچھ سمجھ
میں نہیں آتا تھا کہ یہ آدمی ہیں یا پتنگ کے
گودے کچھ لوگ ہیں کہ نیچے کھڑے انہیں
پھونکیں مار رہے ہیں۔ ان گول مول انسانوں
کے قدم خود تو گنبد کی ڈھلان پر ٹکتے نہ تھے
ہاں صرف پھونک کے زور سے یہ کبھی اوپر جاتے
تھے کبھی نیچے آتے تھے۔ اسی الٹ پلٹ میں
شاید خیال کرتے ہوں گے کہ ستارہ اقبال
تک اب پہونچے اور اب پہونچے میں نے
اپنے خضر راہ سے کہا" پیر و مرشد یہ کیا تماشہ
ہے۔ یہ پھول کر کپا کیوں ہو گئے ہیں پھونک
کے بل پر کیوں اڑ رہے ہیں اگر خدانخواستہ
اتنی اونچائی سے گرے تو کیا حال ہوگا"
فرمایا" بیٹا جو لوگ نیچے کھڑے پھونک
مار رہے ہیں یہ خوشامدی ہیں اور جو ہوا
میں اڑ رہے ہیں وہ خوشامد خورے موٹاپے
نے ان کی چشم حقیقت بین بند کر دی ہے
اور گوش خوشامد شنو کھول دئیے ہیں خود
تو کچھ دکھائی نہیں دیتا ہاں دوسروں سے
یہ سن سن کر آپے سے باہر ہوئے جاتے
ہیں کہ ہم سے آگے کوئی نہیں جب تک
خوشامدی ان کی چاپلوسی میں اپنی ترقی
دیکھیں گے اس وقت تک ان کو یوں ہی
پھونکیں مار مار کر اڑاتے رہیں گے جب
طلب منفعت کی ضرورت نہ رہے گی اس وقت

ان کو چھوڑ کسی دوسرے خوشامدی کے
ساتھ ہو جائیں گے اور پہلے صاحب اس بلندی
پر سے گر کر پاش پاش ہو جائیں گے۔" میں نے
عرض کی مد جناب اگر یہ توپ کا گولہ لڑھکا
تو کئی خوشامدی خود اس کی لپیٹ میں آ جائینگے
بکنے لگے نہیں یہ خوشامدی بڑے پختہ کار لوگ
ہوتے ہیں جب دیکھتے ہیں کہ کسی خوشامدیے
کا وقت آن لگا ہے تو جھٹ ادھر ادھر ہو جاتے
ہیں آپ بچ جاتے ہیں اس کو ٹھکانے لگا دیتے
ہیں خیر یہاں تو کہاں تک اور کیا
کیا دیکھیے گا ان سب لوگوں کی حالت دیکھنے
اور سمجھنے کے لیے عمر نوح چاہیے۔ چل میرے
ساتھ چل تجھے کچھ گنبد کے اندر کا بھی تماشہ
دکھا لاؤں۔" میں نے کہا "ہیں۔ تو کیا یہ گنبد
اندر سے کھوکھلا ہے" فرمایا ہاں اور کیا
تو نے مادیت کو کوئی ٹھوس چیز سمجھا ہے۔ باہر
تو صرف تیلیاں ہیں اس کے کل پرزے تو
سب اندر ہی ہیں۔ اندر ہی سے پچکاریاں
دے دیکر ان کو قوت پہونچائی جاتی ہے۔
ورنہ انسان کی قدرت ہے کہ شیشے کے
ایسے ڈھلان پر ایک قدم ٹھیر سکتا تو کجا ایک
لمحہ ٹک بھی سکے۔" میں نے کہا "بہت خوب
چلیے۔" وہ میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھے اور بات
کی بات میں ہم دونوں دیوار میں سے اچھی
طرح گزر گئے جیسے شیشے میں سے نگاہ اندر
جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ اس سرے سے اس
سرے تک کارخانہ ہی کارخانے پھیلے ہوئے
ہیں۔ ہر ایک ایک کارخانہ بلندی میں آسمان سے
باتیں کرتا ہے اور اپنی وسعت سے

خیال کو شرماتا ہے ہمارے سامنے ہی جو
کارخانہ تھا۔ اس پر بہت بڑے بڑے سیاہ
حرفوں میں لکھا ہوا تھا "کارخانہ جراثیم آوارگی"
بڑے میاں نے مجھ سے اندر چلنے کو کہا میں
نے تامل کیا انہوں نے فرمایا "اب آیا ہے
تو چل دیکھ لے پھر کسی کو یہ چیزیں دیکھنی نصیب
تھوڑی ہوتی ہیں۔" میں نے عرض کی کہ حضرت
معاف کیجیے اندر جو یہ جراثیم مجھ میں سرایت
کر گئے تو پھر میرا کہاں ٹھکانا رہے گا" کہنے
لگے "یہ بھی خوب کہی کہ کہاں ٹھکانا رہے گا۔
بیٹا فیشن ایبل ہو جاؤ گے قوم کے لیڈر بن جاؤ گے
دنیا میں نام ہوگا کچھ کما کھاؤ گے صرف
زبانی جمع خرچ میں ساری عمر چین سے گزر جائیگی
میاں آوارہ ہونے کو بھی ہمت چاہیے۔
تمہارا اندر قدم رکھنے کو دم نکلتا ہے۔ بھلا
آوارہ بننے کی ہمت کہاں سے لاؤ گے" میں نے
کہا "بہت خوب چلیے۔" اندر جا کر کیا دیکھتا ہوں
کہ یہاں سے وہاں تک شیشے کی دیگیں
چولھوں پر چڑھی ہیں مرد اور عورتوں کا لشکر
کا لشکر جسم ننگا اپنے اپنے کام میں لگا ہے
کوئی دیگوں میں عرق ڈال رہا ہے کوئی چولھوں
میں ایندھن ٹھونس رہا ہے ڈاکٹر ہیں کہ
مقیاس الحرارت ہاتھوں میں لیے ادھر
اور ادھر سے ادھر پھر رہے ہیں کبھی اس
دیگ کو دیکھتے ہیں کبھی اس دیگ کو کسی سے
کہتے ہیں اس میں اور عرق ڈالو کسی کو حکم
دیتے ہیں کہ اس کے نیچے اور آنچ لگاؤ کسی
دیگ کو اتار ٹھنڈا کرنے کے لیے رکھ دیتے
ہیں۔ کسی اتری ہوئی دیگ کو چڑھوا دیتے ہیں

غرض ہر شخص اپنے اپنے کام میں اس طرح
مشغول ہے کہ دنیا اور مافیہا کی کچھ خبر نہیں
ایک طرف تیار شدہ سیرم (عرق) کی شیشیاں
بھر کر سربمہر کی جا رہی ہیں ایک طرف پارسل
بندہ بندہ کر روانہ ہو رہے ہیں میں نے
بڑے میاں سے پوچھا "جناب یہ سب کے
سب ننگے کیوں ہیں" فرمایا "خدا اس آگ
کی گرمی سے بچائے کپڑے کا ایک تار بھی
جسم پر ہو تو جل کر راکھ ہو جائے" میں نے
کہا "حضرت اس عرق کا یہاں بہت خرچ
معلوم ہوتا ہے پیپے کے پیپے الٹے جا رہے
ہیں اور بس نہیں ہوتا" کہا یہ عرق نہیں ہے
شراب ہے آوارگی کے جراثیم کی پرورش
اور پختگی کے لیے یہ اکسیر کا کام دیتی ہے کوئی
تیرہ سو برس ہوئے جب اس کارخانہ کو
ایک بڑی مصیبت کا سامنا ہو گیا تھا دنیا کے
ایک بڑے حصہ نے شراب کو ممنوع قرار دیکر
اس کی آمد کو بالکل روک دیا تھا۔ اگر کچھ دنوں
وہی رنگ رہتا تو اس کارخانہ کا دیوالہ
نکلنے میں کسر نہ رہتی مگر اس کارخانہ کا مالک
بھی آفت کا پرکالہ ہے۔ ہوس کے کارخانے
والوں سے مل ملا "عزت و جاہ کے جراثیم"
دینداروں کے خون میں پہونچا دئے نتیجہ یہ
ہوا کہ احکام کی تاویلیں شروع ہوئیں اور
یہ کارخانہ سنبھل گیا۔ اب تو تھوڑے دنوں
سے تو یہ دن دونی اور رات چوگنی ترقی
کر رہا ہے" میں نے یہ دیکھ کر کہ چولھوں میں
بجائے ایندھن کے کپڑے ہی کپڑے جل رہے
ہیں اپنے رہبر سے پوچھا "حضرت کیا یہ

تصدیق اعلیٰ منجن

کب سے تری تاک میں ہوں ساقی
دے جام میں جس قدر ہے باقی

کیا باد بہار ابھر کر آئی
گلشن میں دلہن سنور کر آئی

سب نخل کھڑے ہیں دست بستہ
آراستہ ہے چمن کا رستہ

نرگس نے جو کر دیا اشارا
سنبل کو زلف کو سنوارا

حوضوں میں رواں وہ صاف پانی
گویا ہے شراب زندگانی

دکھلا دوں کچھ اپنی گلفشانی
ہو خامہ فکر میں روانی

پہلے ہو حمد کبریائی
جس نے کونین کی بنا کی

اس بات کو ہے دلیل کامل
ممکن نہیں ہے فعل بغیر فاعل

صانع سبب وجود صنعت
خالق ہی نہ ہو تو کیسی خلقت

ہاتھ اس نے عطا کئے پئے کار
اور پاؤں دیئے برائے رفتار

کی آنکھ کو روشنی عنایت
دی گوش کو قوت سماعت

پھر بندوں پہ یہ فضل باری
کھانے کے لئے غذا اتاری

دانتوں سے ہے لطف سب غذا کا
احسان بڑا ہے کبریا کا

رزاق نے دی جب ایسی نعمت
لازم ہے دانتوں کی حفاظت

دانتوں کو جس میں فائدہ ہے
کہئے وہ کونسی دوا ہے

سرسبز ہوا ان کا نخل مقصد
صالح کے ہیں پسر محمد

دانتوں کے روگ سے بچایا
منجن وہ آپ نے بنایا

تاثیر اس کی کہوں میں کیا ہے
واللہ اکسیر سے سوا ہے

زائل نہ ہو قوت نظر تک
قائم رہیں دانت عمر بھر تک

کل پر نہ کسی طرح سے ٹالو
بہتر ہے کہ آج ہی منگالو

صادق ہوں میرا سخن ہے سچا
پھر بھی جو ہو اشتباہ اچھا

ایک بار تو امتحان کیجئے
لیجئے ضرور دیکھئے

جس سے آگاہ ہر بشر ہے
گوتی پورہ میں ان کا گھر ہے

مرمر کی ہے التجا خدا سے
محفوظ رہیں یہ ہر بلا سے

یارب بطفیل آل یٰسین
آمین آمین ثم آمین

اٹھو سونے والو سحر ہو گئی

از جناب مولوی محمد نذیر الدین صاحب ایم۔ اے رکن دار الترجمہ

جس شخص کو ہندوستان میں مسلمانوں کی عمرانی، سیاسی، اخلاقی اور مذہبی حالت سے واقف ہونیکا موقع ملا وہ چار آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکا کہ کوئی سماں اتنا دردناک نہیں ہوتا جتنا کسی پرانی قوم کا زوال اور وہ بھی اس قوم کا جس نے اپنے زمانہ میں بنی نوع انسان کی کئی قوموں کی سرپرستی کی ہو، ان کو علوم وفنون سے آشنا کیا ہو، ان کیلئے تسکین روحانی کا سرمایہ بہم پہنچایا ہو، مادی ترقی کے اسباب مہیا کئے ہوں، ان کی معاشرتی اور اخلاقی حالت کو درست کیا ہو اور آج خود وہی قوم ہے کہ افلاس کا شکار ہوکر جہالت کا نمونہ بنکر دم توڑ رہی ہے وہ ان کا مذہبی جوش جو کبھی مذہب کی حمایت میں سربکف نظر آتا تھا جھاگ کی طرح بیٹھ گیا ہے، وہ ان کا دبدبہ جو کبھی ہندوستان کو ایک آن میں لرزہ براندام کرتا تھا۔ منوں مٹی تلے دب چکا ہے، وہ ان کی شان وشوکت جو کبھی دیکھنے والوں کی آنکھوں کو خیرہ کردیتی تھی۔ ان سورماؤں کے مرمری قبروں میں باقی رہگئی ہیں جو مقبروں کے زمین دوز مدفنوں میں محو آرام ہیں۔

یہ اعتزال اس قدر عام اور اس درجہ زبردست ہے کہ اس کو نہ تحقیر دبا سکتی ہے نہ ملامت مٹا سکتی ہے۔ جہالت کی گھٹا ٹوپ کا یہ عالم ہے کہ علوم وفنون کی وہ تابناک کرنیں بھی اس میں نفوذ نہیں کرسکتیں جو انتہائی شدت کے ساتھ افق مغرب سے پھوٹ پھوٹ کر دنیا میں اجالا کر رہی ہیں۔ غفلت کی نیند اسقدر گہری ہے کہ نفرت وحقارت، ذلت وخواری کی ٹھوکریں دم بدم پڑ رہی ہیں مگر ٹس سے مس نہیں۔ سچ ہے جو قوم خود فراموشی کے زبردست نشہ میں لڑکھڑا رہی ہو اس کا قعر مذلت میں گر جانا یقینی ہے۔

سرسید خدا ان کی قبر میں رحمت کے پھول برسائے پہلے شخص تھے جنہوں نے انتہائی خلوص کے ساتھ عملی طور پر اس قوم کو جگانے کا بیڑا اٹھایا، علوم جدیدہ کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے جن کی داغ بیل علماء اسلام نے ہی ڈالی تھی علیگڈھ کالج قائم کیا اور ہم سب اس افسوسناک حقیقت سے آگاہ ہیں کہ اس کی بنیادیں کفر کے فتووں کی بھرمار، پیٹ پال ایمان فروش پیشوایان مذہب کے ڈنڈوں کی بارش، اور ان کے غضب آلود نگاہوں کے تیروں کی بوچھار میں انتہائی دقتوں اور روحانی اذیتوں کے باوجود مستحکم کی گئیں۔ حقیقی علمائے اسلام اور مشائخ ملت کے تقدس وعظمت میں کیا کلام ہوسکتا ہے۔ لیکن افسوس یہ واقعہ ہے اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ موجودہ زمانہ میں اسلام اور ان کے پیرووں کو جس قدر نقصان نام نہاد سفید پوش سیاہ قلبوں ایک تال بے تال سرہوکر رقص عریاں کا تماشا دکھانے والوں اور تکفیر کے مہیب عصا کو گھما کر ڈرانیوالے پہلوانوں نے پہنچایا ہے اسقدر دشمنان اسلام نے بھی نہ پہنچایا ہوگا۔ بعض مسلمانوں میں اور عالم بت پرستوں میں کیا فرق باقی رہا۔ اگر کوئی فرق ہے تو یہ ہے کہ ان کی جماعت علحدہ ہے اور ان کی جماعت علحدہ۔ ورنہ افعال دونوں کے ایک ہی ہیں۔ ان کے ہاں بتوں کو پوجا جاتا ہے ان کے ہاں شہدا و اولیا کی پرستش ہوتی ہے۔ ان کے ہاں بھجن گائے جاتے ہیں۔ ان کے ہاں مجلس ترتیب دیجاتی ہے۔ یہ کیا اندھیر ہے کہ وہی سیدھا سادہ مذہب جو معارف کا گنجینہ، حقائق کا سفینہ، سادگی کا نمونہ تھا اور جس نے عقل کو تنویر اور سائنس کو آزادی دے رکھی تھی۔ آج ان فربہ اندام ملت فروش بزرگواروں کے ہاتھوں عقل و سائنس کی قبا مسلمانوں کی قامت پر تنگ کر رہا ہے علم و معارف کا دامن ان کے جسموں سے تار تار کر رہا ہے دینی و دنیوی ترقیوں کا تاج ان کے سر سے جدا کر رہا ہے۔ یہ کیا قیامت ہے کہ سیم وزر کی گنگا جمنی نہریں اغیار کو تو سیراب کر سکتی ہیں۔ ان کی کھیتوں کو تو سرسبز وشاداب کر سکتی ہیں۔ لیکن مسلمان ایک گھونٹ بھی پی نہیں سکتے کہ ملت بیضا کے یہ چھوٹے نمائندے ان کے کناروں پر نگران دور ہی سے تشنہ لب مسلمانوں کو اپنے ڈنڈوں سے سراب کا راستہ دکھاتے ہیں افسوس۔

دشمن جاں یہ میرے ناز کے پالے نکلے

سر سید علیہ الرحمۃ کے بعد جنہوں نے مرض کی صحیح تشخیص کی اور مسلمانوں کی سست رفتار نبض کو دردانگیز طور پر محسوس کیا تھا کوئی اور حکیم پیدا نہیں ہوا جو ان کے نقش قدم پر چلتا، مسلمانوں کی آنکھوں سے جہالت کا پردہ کاٹتا، ان کے خون کو بدعتوں کی آلائش سے پاک کرتا، ان کے متورم دست و پا کو کس بل دیکر قابل حرکت بناتا، علم و ہنر کے تلخ مگر اکسیر صنعت شربت کے گھونٹ پلاتا، افلاس کے زہر کا اثر صنعت و حرفت کے پیالے ملا ملا کر گھٹاتا۔ اس میں شک نہیں کہ حالی مرحوم نے اپنے رقت آمیز ترنم سے ماضی کے گیت گا گا کر مسلمانوں کو بیدار کرنا چاہا، اور اقبال نے اپنے سوز و گداز سے دیگ کو چھیڑ چھیڑ کر ان میں تڑپ اور جلن پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن سونیوالوں نے خواب ہی میں عظمت گذشتہ کی جھلک دیکھی اور خواب ہی میں تڑپنے کا لطف اٹھایا

ان کی نیند اتنی ہلکی نہیں کہ راگ رنگیوں سے، لیڈروں کی چیخ پکار سے، اغیار کے تحقیر آمیز قہقہوں سے بیدار ہو جائے۔ ضرورت اسبات کی ہے کہ عملی تدابیر اختیار کئے جائیں، صنعتی مدارس کھولے جائیں حرفتی ادارے قائم ہوں، غفلت کے باعث جو عقلی تاریکی چھا گئی ہے ان کو زائل کیا جائے انکی آنکھوں کو فہم و شعور کے نور سے منور کیا جائے تاکہ اس کی روشنی میں نظر آجائے کہ وہ بھٹکتے ہوئے کدھر آنکلے ہیں اور جو راستہ انہوں نے اختیار کیا ہے وہ بہ ترکستان است۔

زمانہ قیامت کی چال چل گیا۔ ترقی کی ہزاروں منزلیں طے ہو چکیں، بحر و بر جا چکے آب و ہوا پر قبضہ ہو چکا، ماہ و مریخ کو سر کرنے کے مشورے ہو رہے ہیں، موت و حیات پر قابو پانے کے تدابیر زیر تجربہ ہیں، عناصر کٹھ پتلی کیطرح نچائے جا رہے ہیں

اور مسلمان جہاں تھے وہاں سے بھی کوسوں پیچھے ہٹ چکے ہیں۔ مگر یہ یاد رہے کہ کمزوروں، جاہلوں مفلسوں، بھیک کے ٹکڑے توڑنیوالوں پر دنیا تنگ ہو رہی ہے۔ اگر زندہ رہنا ہے اور کچھ عزت کیساتھ زندہ رہنا ہے تو غفلت کی گیرد جھٹک کر سستی کو جھڑک کر کھڑے ہو جاؤ۔ راستی کو اپنا عصا اور محنت کو اپنا ہمدم بناؤ اور ترقی کی شاہراہ پر سرپٹ دوڑنے لگو کہ زمانہ دور، بہت ہی دور اور اس سے بھی دور نکل چکا ہے۔

اٹھو ورنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

صبح دکن

(از جناب خواجہ محمد ابو تراب صاحب صدیقی وکیل مولوی فاضل منشی فاضل)

حبذا۔ از جانب کہسار باراں در رسید۔ مژدہ باد۔ ابر کرم چوں ابر نیساں شد پدید۔ شاہد گل نکہت باد صبا را ہم شمید

ساقیا برخیز در دہ جام آمد روز عید   یادگار یوم خود مختاری آصف رسید

از دو صد سال۔ ارچہ با فضل خدائے ذوالمنن۔ تاج آزادی بہ فرق شاہ ما شد مرتہن۔ مایۂ ناز جہاں اکنوں ست ایں پہ گل چمن

باغ امید ست بنگر صفحۂ "صبح دکن" از طفیل شاہ محمد عثمان زمن

اے کہ از فیض تو دیدم علم و فن را بامراد۔ آن توئی نیکو شیم۔ فرخ منش عالی نژاد۔ عادل و باذل شجیع و ذی ہمم با خلق و داد

فی الحقیقت ہیچکس دیدہ نہ چوں تو خوش نہاد۔ بلکہ اصلا مادر گیتی چنیں کس را نہ زاد

آں تواضع ہست گر ظاہر شود از سرفراز۔ گر کند عاجز۔ کز و سرزد شود از قسم آز۔ با جمیع کار دولت کیست مشغوف نماز

کیست آں با جاہ و حشمت از ہمہ شئے بے نیاز۔ بادشاہی در ازائے فقر بس کردی گداز

سوئے عقل تو نمی پرد قیاس و وہم و گماں۔ در تو پنہاں است اوصاف ہمہ شاہنشہاں۔ بر خلاف حکم احمد بر نمی تابی عناں۔

زینت "الفقر فخری" نیست از حشمت نہاں۔ اے شہ والا حشم وصفت چساں گردد بیاں

وقت تنظیم چوں گردید یکسر پاش پاش۔ گشت دامنگیر ہر کس را بسے فکر معاش۔ حاجت مرہم ضروری بود بہر ایں خراش

آمدی تا راز خود بر دیگراں گردد نہ فاش   "میر عثمان علی خاں" تا قیامت زندہ باش

روز نوروزی مقابل کے شود از روز ایں۔ آں شنیدہ ہست برکات سوتر را ببیں۔ اے تراب آں یادگار از یارسیاں ہمقریں

ایں ز خود مختاری سلطان ذی دین متیں ۲ پس مبارک باد گو با آیت فتح مبیں۔

۱۱۲۵

مادہ صرف کیڑوں ہی سے پکتا ہے۔" کہنے لگے "ہاں اس کے پکانے میں عصمت کی چادریں عفت کے برقعے اور حیا کی نقابیں جلانی پڑتی ہیں کسی زمانے میں اس ایندھن کا بھی کال ہوگیا تھا مگر اب تو یہاں خرچ سے زیادہ آمد ہے تجربہ سے یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ ستر پوشی کے کپڑے ان کیڑوں کے تیار کرنے کا سب سے اچھا ایندھن ہے کبھی کبھی یہ چیزیں بھی آجاتی ہیں[1]۔ مگر کم اگر اس کارخانہ کی قسمت میں ترقی لکھی ہے تو اس کی کمی نہ رہے گی اچھا چلو اب دوسرے کارخانہ کو دیکھیں"

یہاں سے نکل کر ہم دوسری عمارت کے پاس پہونچے اس پر موٹے موٹے حرفوں میں لکھا تھا "سچ اور جھوٹ کے جراثیم کا مشترکہ کارخانہ" میں نے کہا جناب والا یہ تو علیحدہ علیحدہ کارخانے ہونے چاہئیں یہ ملے جلے کیوں ہیں" فرمایا "ہاں پہلے یہ دونوں الگ الگ ہی تھے۔ سچ کا کارخانہ ٹوٹنے لگا تو جھوٹ کے کارخانے کو شریک کر لیا گیا بات یہ ہے کہ سچ کے جراثیم ایسے تلخ ہیں کہ لوگ ان کی برداشت نہیں کر سکتے جھوٹ کے جراثیم کی آمیزش سے ایک نیا کیڑا پیدا ہوگیا ہے اس کو یہاں کی اصطلاح میں "دروغ مصلحت آمیز" کہتے ہیں اس کا سیرم دنیا والوں کو ایسا راس آیا ہے کہ کیا بیان کروں بنڈل کے بنڈل چلے جا رہے ہیں اور بس نہیں ہوتی اس سے بڑے یہاں صرف دو ہی کارخانے ہیں ایک "ہوس" کا اور دوسرا "ریاکاری" کا ریاکاری کے جراثیم کا تو یہ حال ہے کہ جب تک ان کو شریک نہ کیا جائے کوئی سیرم تیار ہی نہیں ہوتا پہلے یہاں "قناعت" کا بھی ایک بڑا کارخانہ تھا۔ مگر اب اس کو ہوس کے کارخانے نے خرید لیا ہے "انصاف کا کارخانہ" "دولت کے کارخانے" کے ہاتھ آگیا اور "نیکی کا کارخانہ" ریاکاری کی کمپنی میں ضم ہوگیا پہلے زمانہ میں دینداری کے سیرم کی سب سے زیادہ مانگ تھی اور اسی کی آمد سے روحانیت کے گنبد کی درستی ہوتی تھی جب سے اس سیرم کی مانگ کم ہوگئی اس گنبد کی دیکھ بھال نہ رہی نتیجہ یہ ہوا کہ ایسا مضبوط اور شاندار گنبد تباہ ہوگیا۔ اب دینداری کا کارخانہ برائے نام چل رہا ہے جو تھوڑا بہت مال تیار ہوتا ہے اس میں بھی ریاکاری کے جراثیم شریک کرنے پڑتے ہیں۔ خالص مال کی نکاسی اس زمانہ میں بالکل بند ہے اچھا تو یہاں کیوں کھڑا ہوگیا آگے بڑھ اگر یونہی ہر جگہ ٹھٹکا تو ساری عمر بھی ان کارخانوں کے دیکھنے کے لیے کافی نہ ہوگی" یہ سنکر میں نے آگے قدم بڑھایا۔ اب جس عمارت کے سامنے ہم پہونچے اس کی وسعت کچھ نہ پوچھو ساری دنیا اس کے ایک کونے میں سما جائے اور آسمان اس کی چھت کے نیچے آجائے عمارت کی دوکانوں پر بڑے بڑے خوبصورت سنہری حرفوں میں لکھا ہوا تھا "کارخانہ ہوس" اس کارخانہ کی ہزاروں شاخیں تھیں کسی پر تختی لگی تھی "شاخ جاہ و عزت" کسی پر لکھا تھا "شاخ جوع الارض" ایک سائن بورڈ پر تھا "شاخ ملازمت" میں نے اپنے رہبر سے کہا چلئے اسے دیکھیں یہ بڑی دلچسپ شاخ معلوم ہوتی ہے"

کہنے لگے "چلو دیکھ لو ہوس کے کارخانے کی یہ شاخ ہمیشہ سے خوب چل رہی ہے ہاں آجکل ہندوستان میں اس سیرم کی سب سے زیادہ مانگ ہے اندر جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ وہی دیگوں پر دیگیں چڑھی ہیں سوکھے سہمے آدمی چولہوں میں تعلیمی ڈگریاں سفارشی رقعے اور مدحی قصیدے دھڑا دھڑ جلا رہے ہیں بھلا کاغذ کی کیا بساط آگ ذرا بھڑکی اور ٹھنڈی ہوگئی۔ انہوں نے پھر کاغذوں کے بنڈل لیے اور چولہے میں رکھ دیے بیحیائی کی پھکنی سے خوشامد کی پھونکیں ماریں پھر ذرا شعلہ اٹھا اور دھم ہوکر رہ گیا میں نے اپنے رہبر کی طرف پھر کر دیکھا۔ وہ مسکرا کر کہنے لگے "یہ مادہ ذرا مشکل سے بنتا ہے ایک انار اور صد بیمار کا مضمون ہے مانگ بہت ہے مال کم تیار ہوتا ہے بعضوں کو ملتا ہے بعض مانگتے ہی مانگتے ختم ہو جاتے ہیں جو خالی ہاتھ رہتے تھے اب انہوں نے "شورش کے جراثیم" کی پکار دیا

---

[1] ۔ ایک پوری قوم کی قوم نے سارے کا سارا لباس اتار پھینکا ہے ابھی تھوڑے دن ہوئے یوروپ کے ایک ہوٹل میں ایک بیگم صاحبہ مادر زاد ننگی تشریف لائی تھیں دوسری میں کہ ہم ننگی ناچتی ہیں۔

یعنی شروع کر دی ہیں۔ پچکاریاں لیتے ہیں اور مادیت کی گنبد کو کھودتے ہیں بھر لیتے ہیں۔ پھر کھود دیتے ہیں۔ ایک دن آنے والا ہے کہ انہی کے ہاتھوں اس گنبد کا بھی خاتمہ ہو جائیگا روحانیت پہلے ہی جا چکے اب مادیت بھی رخصت ہو جائے گی نتیجہ یہ ہوگا کہ انسانیت سے نکل کر سب کے سب پھر وہی جنگلی کے جنگلی ہو جائیں گے" میں نے کہا خیر دیکھا جائے گا۔ میں یہاں سے جاتے ہی سارا بھانڈا پھوڑے دیتا ہوں۔ اچھا ہوا کہ میں یہاں آگیا نہیں تو دنیا ہی تباہ ہو جاتی" یہ کہکر میں وہاں سے بھاگا۔ بڑے میاں نے غل مچایا" ارے بھائی ذرا ٹھہر یہاں کا کچھ اور رنگ بھی دیکھتا جا"

میں نے کہا بس حضرت بس بہت کچھ دیکھ لیا۔ مجھے پہلے اس بولشویک حضرات کا انتظام کرنا ہے۔ ابھی سے روک تھام نہ کی تو اپنے ساتھ یہ ساری دنیا کو لے مریں گے" وہ پہنچتے ہی کہے میاں کیوں دیوانہ ہوا ہے۔ بتری کون سنتا ہے۔ بیسیوں اس کارخانوں کو دیکھکر جا چکے ہیں۔ وہاں جا کر بہت غل مچایا مگر ان کی آواز نقارخانہ میں طوطی کی آواز ہو کر رہ گئی۔ وہاں تو "سماجی کے جراثیم" اتنے ٹھونس دیے گئے کہ تجھ جیسے اگر ہزار سمجھدار بھی اور آ جائیں تو سب کو بے وقوف سمجھیں اور پاگل خانہ پہنچا دیں۔ بڑے میاں نے پہلے سمجھایا۔ [۱] خوشامد کی۔ جب دیکھا کہ یہ کسی طرح نہیں مانتا

تو لپک کر میرا دامن پکڑ لیا۔ مجھے بہت برا معلوم ہوا دبا کر ایک ٹھوکر رسید کی۔ ٹھوکر سے پاؤں ایسا جھنجھنایا کہ آنکھ کھل گئی۔

اب جو دیکھتا ہوں کہ تو سامنے میز الٹی پڑی ہے اور میں بیٹھا اپنا پنجہ دبا رہا ہوں خیر جو ہوا سو ہوا دنیا کا موجودہ نقشہ تو دیکھ آیا۔

---

[۱] سچ ہے دل ہر طرح سمجھاتا ہے خوشامد کرتا ہے خفا ہوتا ہے۔ سرزنش کرتا ہے لیکن سب اس کی باتوں کو ٹھکرا دیتے ہیں اور آخر نقصان اٹھاتے ہیں

رسالہ اردو کی "غالب" پر تنقید

از جناب ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ مصنف "غالب"

رسالہ "اردو" (اورنگ آباد) ایک زمانہ سے اردو زبان و ادب کی خدمت انجام دے رہا ہے اس میں بعض اوقات ایسے فاضلانہ مضامین بھی شایع ہوئے ہیں جن کا ترجمہ اگر یورپین زبانوں میں کیا جائے تو بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا لیکن اس رسالہ کا شعبہ تبصرہ ایک ایسی ہیئت لئے ہوئے ملک کے سامنے آتا ہے کہ دیکھنے والا یہ کہہ اٹھتا ہے کہ بہتر ہوگا کہ مدیر رسالہ صرف اعلیٰ کے مضامین سے اس کو زینت دیا

کریں اور تبصرہ نویسی سے یک لخت کنارہ کشی کرلیں۔ تبصرہ کا راستہ بہت دشوار گزار راستہ ہے اس پر قدم رکھنے والے کے لیے صرف اردو زبان کا جاننا یا چند شوقیانہ محاورات کو اپنا تکیہ کلام بنا لینا کافی نہیں ہے یہاں تنقید کی دیوی کو مشعل راہ بنا کر اپنا سر قدم اٹھانا پڑتا ہے۔ تبصرہ نویسی حقیقت کی ترجمانی ہے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ تبصرہ نویس حقیقت تک پہونچنے کی فکر رکھتا ہو اگر تبصرہ نویس واقعات و حقائق سے منہ

موڑ لے تو وہ بجائے حقیقت رسی کے ناظرین کو گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے۔

میری کتاب "غالب" پر مولانا عبدالحق صاحب مدیر "رسالہ اردو" نے ماہ جنوری ۱۹۲۹ء کی اشاعت میں جو تبصرہ کیا ہے وہ رسالہ اردو کی تنقید کا ایک دلچسپ نمونہ ہے چونکہ اس تبصرہ سے ان لوگوں میں جنکی نظروں سے میری کتاب نہیں گزری ہے غلط فہمی پھیلنے کا اندیشہ ہے اس لیے میں مناسب خیال کرتا ہوں کہ مولانا کے تبصرہ کی حقیقت

بیان کروں۔

حسب عادت مولانا نے اصل مضمون سے گریز کیا ہے۔ میرا مضمون دراصل کیا ہے؟ "غالب کی اردو شاعری پر تنقید" غالب کی شاعری داخلی شاعری میں شمار ہوتی ہے۔ جس میں شاعر مختلف اصناف کے ذریعہ مثلاً غزل، رباعی وغیرہ اپنی ذاتی جذبات اور تخیلات کا اظہار کرتا ہے۔ اس لیے میں نے اپنی کتاب میں چند اصول قرار دیے ہیں جو میرے خیال میں سر داخلی شاعری کی تنقید میں مدد دے سکتے ہیں۔ میں نے ان اصول کی روشنی میں غالب کی شاعری کی ایک تصویر کھینچی ہے ممکن ہے کہ مولانا کو اس تصویر سے غالب کے پہچاننے میں مشکل پیش آئی ہو۔ اگر یہی تھا تو بہ حیثیت تبصرہ نویس ان کا فرض اولین یہ تھا کہ میرے قرار دادہ اصول کی تنقید کرتے اور ان کی خامیاں بیان کرتے اس کے بعد وہ خود اپنے ان خاص اصولوں کی تشریح کرتے جن کو پیش نظر رکھکر وہ غالب کو کسی اور روپ میں دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ مولانا اصولی بحث سے ہمیشہ پہلو تہی کرتے ہیں۔ ان کا صرف یہ کہدینا ہرگز کافی نہیں ہوسکتا کہ میں نے اپنی تنقید میں اردو شاعری کا لحاظ نہیں رکھا یہ سراسر خلاف واقعہ ہے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے "کتاب غالب" کے صفحات ۳۱ تا ۵۴ اور باب پنجم تا ہفتم کا مطالعہ غور سے نہیں فرمایا۔

اپنے اصلی فرض کو انجام دینے کے بجائے مولانا نے طعن و تشنیع سے کام لیا ہے کہیں کہیں میرے الفاظ کا ایسا نرالا ترجمہ کر بیٹھتے ہیں کہ مجھکو شرم آتی ہے کہ ایک انگریزی میں لکھی ہوئی کتاب اس نے رسالہ اردو کو کیوں بھیجی۔ باب دوم میں میں نے اس امر پر بحث کی ہے کہ غالب کی سوانح عمری کی ترتیب دینے میں کس قسم کا مواد فراہم کرنے کی ضرورت اور اس کی ترتیب و تہذیب سے غالب کی حیات اور اس کے کمال پر کس انداز سے روشنی ڈالی جاسکتی ہے اس خصوص میں تفصیل کے ساتھ میں نے اس قسم کے مواد کی فہرست بھی بتلائی ہے مولانا اس فہرست کو نظر حیرت سے دیکھکر یہ فرماتے ہیں۔ "نہ تو نو من تیل ہوگا نہ رادھا نا چے گی۔" بالکل صحیح لیکن کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ محقق کے کسی مضمون کی تحقیق و تلاش سے بالکل مایوس ہو جائے اور بیچاری رادھا کو اندھیرے میں ہی ناچنے پر مجبور کیا جائے۔ اس ہی قسم کے ظلمت پرست رجحانات کا نتیجہ ہے کہ عہد حاضرہ کی اکثر و بیشتر تصانیف تاریکی کی پیداوار معلوم ہوتی ہے۔

چوتھا باب ایک اہم باب ہے جس میں میں نے انگلستان کے مشہور تنقید نگار رسٹر لیاسیلس ایبرن کرامبے کے نظریہ شاعری میں نمایاں ترمیم کی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ ترمیم بالکل نئی ہے اس میں اردو کی داخلی شاعری کی خصوصیات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے اور یہ شعر کا ایک ایسا عام معیار قایم کرتی ہے جس سے مشرق و مغرب کا داخلی کلام جانچا جاسکتا ہے اس اہم باب کے متعلق مولانا جس قدر فرماسکتے تھے وہ صرف یہ ہے کہ "شعر کسے کہتے ہیں" یہ مقام ایسا تھا کہ میرے معیار کی جانچ پوری طرح کی جاتی اور اس کے نقائص اس طور پر بیان کیے جاتے جس سے یہ واضح ہو جاتا کہ مولانا کی رائے میں شعر کس کو کہتے ہیں۔

چھٹے باب کے متعلق آپ فرماتے ہیں کہ "اس میں شاعری کی عظمت پر بحث ہے یہاں ڈاکٹر صاحب بہک گئے ہیں اس کی ضرورت اس موقع پر مطلق سمجھ میں نہیں آتی۔" یہ واضح رہے کہ اس باب کا عنوان "Greatness in Poetry" رکھا گیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ کونسی شاعری ملبند پایہ کہی جاسکتی ہے یا کس قسم کی شاعری عظمت رکھتی ہے اس عنوان پر بحث کرنیکی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ اس سے پہلے میں نے عام شاعری کا ایک معیار قرار دیا تھا اس کے بعد ایک شاعر اور دوسرے شاعر کی عظمت میں امتیاز کرنے کے لیے ایک اور معیار کی ضرورت تھی جس کو صراحت کے ساتھ میں نے اس باب میں قایم کیا ہے پھر مولانا کیسے کہہ سکتے ہیں کہ "اس کی ضرورت اس موقع پر مطلق سمجھ میں نہیں آتی" جب تک ایسے معیار کو پیش نہ کیا جائے اس وقت تک کیسے معلوم ہوگا کہ غالب کا درجہ دوسرے شعرا میں کیا ہے یہ بھی ایک مقام تھا کہ مولانا میرے اس معیار کا تجزیہ فرماتے اور قارئین غالب کو یہ فیصلہ کرنے کا موقع دیتے کہ میرا معیار کہاں تک صحیح اصول پر مبنی ہے مگر اس کا کہاں امکان تھا۔ مولانا نے تو . . . . "Greatness in Poetry"

یعنے شاعری میں عظمت کو [illegible]
[illegible] یعنے شاعری کی عظمت
سمجھ لیا یہلا مجھے غالب کی شاعری کی تنقید میں
شاعری کی عظمت پر بحث کرنے کی کیا ضرورت
پڑی تھی میں نے تو پہلے "شعر کیا ہے" اس کی
توضیح کی۔ اس کے بعد اعلیٰ شعر کیا ہے یا عظمت
رکھنے والی شاعری کیا ہے اس کی صراحت کر رہا
تھا لیکن بدقسمتی سے مولانا نے لفظ "[illegible]" یعنے
"یں" اور [illegible] یعنے "کی" کے فرق کرنے میں
سہو کیا اور یہ سمجھ لیا کہ میں اپنے مرکز سے ہٹکر
ایک بے محل عنوان پر بحث کرنا چاہتا ہوں
اور یہ لکھدیا کہ "یہاں ڈاکٹر صاحب بہک گئے"
[illegible] مولانا نے عنوان سے ایک قدم آگے
بڑھایا ہوتا اور اصل مضمون بھی پڑھ لیا ہوتا تو
ان کے اس قدر "نعل در آتش" ہونے کی
نوبت نہ آتی۔ کیا میں مولانا کی خدمت میں یہ عرض
کرسکتا ہوں کہ بعض وقت سیانا انسان بھی الفاظ
کے صحیح معنے نہ سمجھنے سے "بہک" جاتا ہے۔

ساتواں باب بھی ایک اہم باب ہے اس میں
غالب کے اشعار کی تین قسمیں تبلائی گئی ہیں۔ ایک وہ قسم
جسمیں متقدمین یا معاصرین شعراء کے مضامین میں جدت
طرازی کی گئی ہے اس قسم کے اشعار کا تعلق دماغ
سے ہے نہ کہ دل سے دوسری قسم وہ ہے جسمیں جذبہ
موجود ہے لیکن وہ زیادہ تر دماغی اور ذہنی کاوش
کا پتہ دیتی ہے اور تیسری قسم خالص داخلی اشعار
کی ہے جس میں دل و دماغ اور جذبہ اور تخیل میں
بہترین امتزاج پایا جاتا ہے اور اس ہی میں
غالب کی اصلی شان نظر آتی ہے۔ اپنے تبصرہ
میں مولانا نے نہ اس تیسری قسم کا ذکر فرمایا اور
نہ دوسری کا بلکہ اپنے ناظرین کو یہ سمجھانے کی کوشش
کی ہے کہ میں غالب کے کلام کو تمام تر "صناعی شاعری"
سمجھتا ہوں۔ یہ حقیقت پر پردہ ڈالنا ہے اس باب میں
بعض جگہ جو اشعار میں نے موقع و محل کے لحاظ سے بطور
تمثیل پیش کیے ہیں انکو مولانا نے اپنی جگہ سے ہٹاکر
کسی اور مقام پر چسپاں کردیا ہے اور پھر ان پر
رائے زنی بھی کی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ایک
موقع پر جرات کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں کہ ڈاکٹر
صاحب نے ایک جگہ تحریر فرمایا کہ غالب کے نقادوں
کی تحریریں زیادہ تر ایسے ہی لوگوں کے پسند خاطر
ہوئی ہیں جنکی تعلیم دیسی طریقہ پر ہوئی ہے اور
جنکے حس جمالیات پر مغربی ادب کی چھینٹ تک
نہیں پڑی"۔ جس عبارت کا یہ ترجمہ کیا گیا ہے
وہ میری کتاب "غالب" کے پہلے ہی صفحہ پر موجود
ہیں ناظرین خود بہ آسانی معلوم کرسکتے ہیں کہ مولانا
نے میرے خیالات کی کہاں تک صحیح ترجمانی کی ہے
اور کیا حقیقت میں میری رائے غالب کے جملہ
نقادوں کے متعلق یہی ہے۔

خلاصہ یہ کہ مولانا نے نہ تو میرے اصولوں کی تنقید
یا تردید فرمائی اور نہ غالب کی شاعری کو سمجھنے کا
کوئی ان کا اپنا خاص طریقہ یا معیار پیش کیا "شب
وستم" کو اپنا تکیہ بنایا انگریزی فقروں یا جملوں کا
صحیح مفہوم نہ کھل سکا تو طیش میں آکر مجھکو مجنون
اور بہکا ہوا قرار دیا اور کہیں غالب کے ان اشعار
کو جو میں نے بطور مثال خاص خاص عنوانات کے
تحت درج کیے تھے مولانا نے اپنے طرز قدیم پر خلط
ملط کرکے رسالہ "اردو" کے "ناقدانہ اخلاق" کا
ثبوت دیا خدا کا شکر ہے کہ باوجود ان کیفیات
کے مولانا نے میرے بعض انقلابی خیالات
سے اتفاق کیا ہے کہ غالب مرحوم نہ صوفی تھے
اور نہ منجم تھے اور نہ محب وطن لطف یہ ہے کہ
اس فہرست میں مولانا نے اپنی رد میں یہ بھی نظر
کرم سے اضافہ کردیا ہے کہ غالب "عالم" بھی
نہیں تھے جو میرے لیے بالکل ایک نئی بات
ہے۔ خیر ابتدا میں اتنا بھی اعتراف خواہ
جھنجلا کر ہی کیوں نہ کیا جائے آئندہ کے
لیے خوش گوار توقعات کا باعث ہوسکتا ہے۔

آخر میں اس کا اظہار بھی ضروری
خیال کرتا ہوں کہ کتاب غالب کے لکھنے
سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ غالب کی عظمت
کو گھٹا کر ملی یہ ان ہی حضرات کو زیب دیتا
ہے جو علم تنقید سے بے بہرہ ہیں اور اپنے
مجنونانہ عشق و محبت میں غالب پر جو آسمان
غزل گوئی کا ایک درخشاں ستارہ ہے "خاک
ڈال رہے ہیں" اور جو اس کو اپنے اصلی
خط و خال میں ظاہر ہونے نہیں دیتے اور
اس کو ہرجائی بناکر ہر غیر جنس شاعر سے
ٹکرانے کی کوشش میں سرگرداں رہتے
ہیں۔

میں توقع کرتا ہوں کہ قارئین "غالب"
کتاب کے مضمون پر غور فرمائیں گے نہ کہ اس
امر پر کہ میں خدانخواستہ اس سرزمین میں نہیں
پیدا ہوا جہاں کا ہر پڑھا لکھا شعر و سخن اور
زبان و ادب پر رائے دینے کا خود کو حق دار
سمجھتا ہے۔

نظم در مدح اعلیحضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہ

از جناب صالح بن عمر صاحب وفا مدرس مدرسہ وسطانیہ عادل آباد

آج دل کے ذرہ ذرہ میں جمال یار ہے — عرش اعلیٰ پر دماغ حسرت دیدار ہے

مست ہے بیخود ہے پھر بھی طالب دیدار ہے — اللہ اللہ تیرا دیوانہ بھی کیا ہشیار ہے

اے شہ ذی مرتبت والا گہر عالی نسب — مدح ناممکن تری اے آفتاب آثار ہے

اے شہ مسلم دکن کے بادشاہ دلق کوش — چرخ چکرائے وہ تیری سطوت دربار ہے

جنبش ابرو ہے تیری کارفرمائے جہاں — یادگار عہد بن ادہم تیری سرکار ہے

عہد تیرا عہد فاروقی کی ایک زندہ مثال — دل لرزتے ہیں وہ سادہ شوکت دربار ہے

ایک عالم پر تیری چھائی ہوئی ہیں ہیبتیں — تیغ ہمت تیری ہر سو برسر پیکار ہے

تیری ہستی کیا ہے اک پیغام لطف ایزدی — تیرا سایہ بھی نزول رحمت غفار ہے

عدل تیرا ایک ہے شیخ و برہمن کے لئے — تیری نظروں میں برابر سبحہ و زنار ہے

تیری فیاضی میں ہے قانون فطرت کی جھلک — ہے عطا اس کے لئے جو واقعی حقدار ہے

تو وہ یوسف ہے کہ نادیدہ بھی تیرا مشتری — ہر جگہ تیرے لئے اک مصر کا بازار ہے

ڈوبتوں کو ایک لے دے کر سہارا ہے تیرا — ناخدا اے شاہ گر تو ہے بیڑا پار ہے

ہند و ترک شام و حلب مصر و ایران و عرب — الغرض دنیا تری منت کش ایثار ہے

تو رہے سر پر دکن کے حشر تک سایہ فگن — بلبل شیدا کے دم سے رونق گلزار ہے

دکن کی علمی ترقیاں اور آئندہ توقعات

از مولوی احسان احمد صاحب بی اے رکن دارالترجمہ

واقعات عالم پر ذرا امعانِ نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علم و آزادی و جہل و غلامی کو باہم علت و معلول کی سی نسبت ہے۔ جو اقوام علمی ترقی میں بس مصروف ہیں وہ گویا کہ آزادی کی راہ پر گامزن ہیں اور جن کا دامن کے موتیوں سے پُر ہے وہ قدرت کی اس نعمت عظمیٰ سے بہرہ ہیں۔ جہل نے علم پر کبھی فتح نہیں پائی اب ہوا یہی کہ غیر متمدن اور وحشی اقوام نے میدان جنگ میں تمدن اور تعلیم یافتہ اقوام پر فتح پائی ہے مگر وہ فتح کبھی پائدار نہیں ہوتی۔ علم غالب آیا ہے اور ہوں نے یا تو زور شمشیر ان کو اپنے ملک سے باہر نکالدیا ہے اور اگر بعض وجوہ کی بنا پر وہ اس میں ناکام رہتے ہیں تو بھی وہ غلام نہیں ہیں بلکہ فاتح خود بخود مفتوح بن گئے ہیں۔ ان کو ہر وقت اپنے سے زیادہ پڑھے لکھے اور فہمیدہ اشخاص کی ضرورت ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ وہ اپنے آپ کو محکوموں میں ختم کرنے اور ان میں گم ہو جانے پر مجبور پاتے ہیں۔ تاریخ علم اس قسم کی مثالوں سے پر ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ایرانی کبھی یونان پر قبضہ نہیں جما سکے اور رومی فاتح یونانی ہو کر ایک حد تک یونانی بنجانے پر مجبور ہوئے۔ تاتاریوں نے اسلامی سلطنتوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی مگر کیا ہوا۔ دوسری پشت میں خود حلقہ بگوش اسلام اور کعبہ کے نگہبان بنا گئے۔ یہی وجہ تھی کہ آخری دور میں مرہٹے اپنی حکومت قائم نہیں رکھ سکے۔ اور احمد شاہ ابدالی نے

باوجود فتحیاب ہونے کے ہندوستان جیسے ملک میں اپنی سلطنت کے قائم کرنے خیال نہیں کیا دور کیوں جاؤ حال ہی کی مثال لو۔ جرمنی اور اتحادیوں کے مابین کیسی عداوت تھی اور نیز جنگ عظیم کی ہولناکی کا خیال کرو۔ اتحادیوں کو جرمنی سے کسقدر مالی و جانی نقصانات نہیں پہونچے مگر مغلوب کر لینے کے بعد ہی انہوں نے جرمنی کو غلام بنانے کا خیال نہیں کیا

یہ ہیں علم کی برکات۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کس قسم کی علمی ترقی کی ہیں اس زمانہ میں ضرورت ہے۔ کن کن حبالت میں ہمارا قدم آگے بڑھا ہے اور کون کونسے شعبے ہنوز ہماری توجہ کے محتاج ہیں۔

زمانہ حال کے لحاظ سے علمی ترقی کو تین شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ذہنی عقلی و صنعتی۔ پہلے عنوان کے ماتحت تاریخ ادبیات السنہ وغیرہ کا مطالعہ آتا ہے۔ دوسرے عنوان میں فلسفہ و حکمیات یعنی طبیعات کیمیا ریاضیات و دیگر علوم داخل ہیں۔ تیسرے کے ماتحت وہ علوم و فنون آتے ہیں جن میں انسان کے ہاتھ کو دخل ہوتا۔ طب، انجینیری، معماری، ہوابازی، جہاز رانی، آہنگری نجاری وغیرہ۔

دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی تاسیس سے ایک حد تک ان تینوں شعبوں میں ترقی ہوئی ہے مگر وہ

ایک حد تک ہی ہے کیونکہ جو کام ہمارے سامنے ہے اس میں جاپانی جیسی جفاکش اور حیرت انگیز ترقی کرنے والی قوم کو ایک صدی کے قریب لگی ہے مغربی اقوام کو تو چار پانچ صدیاں صرف کرنی پڑی ہیں۔ اس میں بھی شک نہیں کہ جو کچھ ہو چکا ہے وہ پیش نظر کام کی عظمت ہی کے اعتبار سے کم معلوم ہوتا ہے ورنہ دس بارہ سال جیسی قلیل مدت میں تین سو سے زائد مبسوط علمی کتابوں کو اپنی زبان منتقل کر لینا ملک کی ذہنی و عقلی فضا میں ایک انقلاب پیدا ہو جانے کے مساوی ہے۔ اسی طرح ذریعہ تعلیم انگریزی کو چھوڑ کر ملکی زبان قرار دینے میں بھی ترقی کی طرف ایک اہم قدم اٹھا ہے اور اس میں جو کامیابی ہوئی ہے وہ بھی ایسی ہے کہ اغیار بھی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے مگر یہ سب کچھ اعلیٰ حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کی بے مثل فیاضی اور علم پروری کا طفیل ہے ملک نے کسی خاص حرکت و بیداری کا ثبوت نہیں دیا۔ نیز یہ کہ آگے بڑھنے کیلئے طے کئے ہوئے راستہ کو دیکھنا بھی مفید نہیں ہو سکتا اس لئے جو کچھ کہ ہو چکا ہے اس کا تذکرہ بیسود ہے۔ مناسب یہ ہوگا کہ دیکھیں تعلیمی ترقی کے مذکورہ تینوں شعبوں میں اس وقت ہماری حالت کیسی ہے اور آئندہ ہم کو کیا کرنا چاہئے۔

ذہنی شعبے میں گو ہماری حالت اتنی بری نہیں ہے

جتنی کہ اور شعبوں میں ہے گر یہی نہیں ہے ملک کی تعلیم یافتہ آبادی یعنے وہ جو کسی ایک زبان میں لکھ پڑھ سکتی ہو۔ ابھی مشکل سے سات آٹھ فیصد ہے اسنہ غیر میں سے زیادہ تر انگریزی فارسی عربی کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ لیکن ان کے علاوہ اور زندہ ممالک کی زبانیں جاننے والے انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ مدارس جدید میں طلبہ تاریخ کا بہت کچھ مطالعہ کرتے ہیں اور اس سے خیال میں بلندی اور ماضی سے آگاہی ہوتی ہے مگر اس کا وہ زیادہ تر اس وجہ سے مطالعہ کرتے ہیں کہ نسبتہً سہل مضمون اور سند حاصل کرنے کا ایک عمدہ ذریعہ ہے اور اس وجہ سے وہ دوسرے دیگر اہم علوم کو نظر انداز کر دیتے ہیں اس امر کا صحیح اندازہ کرنے کیلئے کہ تعلیمی اعتبار سے ہماری حالت دنیا کی ترقی یافتہ اقوام کے مقابلہ میں کیا ہے مناسب یہ ہوگا کہ دیکھا جائے ان میں پڑھے لکھوں کا فیصدی کیا اوسط ہے۔ اس وقت جاپان میں تعلیم یافتہ ۹۵ فیصدی انگلستان میں ۹۲ فیصدی اور جرمنی میں سو فیصدی ہیں۔ اب ان کے مقابلہ میں اپنے سات آٹھ فیصدی کے اوسط کو رکھو، ببیں تفاوت رہ از کجا است تا بہ کجا۔

دوسرے شعبہ میں ہم پہلے شعبے کے اعتبار سے بعید ہی پیچھے ہیں۔ ہمارے یہاں طلبہ ریاضی و حکمات کی طرف بہت کم توجہ کرتے ہیں ضرورت ہے کہ ان مضامین کیلئے ترغیبی وظائف دیکر طلبہ کو متوجہ کیا جائے۔ فلسفہ کا مطالعہ کچھ نہ کچھ ہوتا ہے گر اس سے فلسفیانہ جذبہ پیدا نہیں ہوتا بلکہ مذہب سے تو بدگمان ہونے لگتے ہیں گر غور و فکر نہیں کر سکتے۔ اسکی وجہ صرف یہی ہے کہ وہ علم کو علم کیخاطر نہیں بلکہ سند کیخاطر حاصل کرتے ہیں۔

تیسرے شعبے میں ہمارے یہاں ایک کالج انجنیری ایک طبی کالج ہے اور دو جگہ کم و بیش صنعتی تعلیم ہوتی ہے یہ حالت سابق کی نسبت کتنی ہی بہتر رہی مگر کسی طرح سے اطمینان بخش نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ لوگ تعلیم پاکر اس کے متوقع ہوتے ہیں کہ حکومت ان کی قدردانی کرے ان کو خدمات سے سرفراز کرے۔ مگر جب تعلیم کی کثرت ہوگی تو ظاہر ہے کہ حکومت سب کو خدمات نہیں دے سکتی اس سے ایکطرف تو تعلیم یافتہ لوگوں کی قسمت گر جاتی ہے اور چونکہ یہ کسی خاص پیشہ کے اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے اس لئے ملک میں بیکاروں کا ہونا لازمی ہے اس کیلئے ضرورت ہے کہ جدید حرفتی تعلیم کو عام کیا جائے مدارس میں سائنس اور ابتدائی حرفتی تعلیم کو لازمی کر دیا جائے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کیمپ کالجوں میں بڑے پیمانہ پر ایک ٹکنیکل کالج کا افتتاح کیا جائے اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ طلبہ جب تعلیم پاکر دنیا کے سمندر میں نکلیں گے تو وہ بے سروسامان ہونگے انہیں کوئی نہ کوئی ہنر آتا ہوگا جس سے وہ روزی کماکر اپنا پیٹ پال سکیں گے۔ ملکی صنعت کو ترقی ہوگی۔ ملک میں اختراع و ایجاد کا مادہ پیدا ہوگا۔ اور حکومت کو ملازمین فراہم کرنے کی فکر سے نجات ملجائیگی۔

اس ذیل میں طلبا سے بھی اس قدر کہنے کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی ذہانت بدلیں۔ علم کو خدمت کی خاطر نہیں بلکہ علم کی خاطر حاصل کریں۔ کیونکہ اگر علم کو علم کی خاطر حاصل نہ کریں گے تو علم مقصود بالذات نہ رہے گا جس سے تعلیم کے ناقص رہجانے کا قوی احتمال ہے۔ نہ طالب علم کا وہ ذوق و شوق رہیگا جو ترقی کی اصل اساس ہے اور خود وہ مقصد بھی بوجہ احسن حاصل نہ ہوگا جس کے لئے علم جیسے شریف مقصد کو پس پشت ڈالا ہے۔ یقینی جب تعلیم کی طرف پوری توجہ ہوگی تو محدود استعداد جن پر کہ عموماً اس زمانہ میں خدمت کا دار و مدار ہے حاصل نہ ہوں گی اور اگر کسی ناجائز سفارشیں وغیرہ کی بنا پر کامیابی ہو بھی گئی تو اہلیت و قابلیت نہ ہوگی ایسا شخص عمر بھر نااہل کہلائے گا اور ممکن ہے کہ اپنے محبوب خدمت کو بھی کھو بیٹھے اور بالکل اسی کا مصداق بنجائیگا کہ

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔
نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے۔

بس اے عزیزو! علم کو علم کیلئے حاصل کرو دوران تعلیم میں تمہارا مقصود علم کے علاوہ اور کچھ نہ ہونا چاہئیے ایک وقت ایسا آئیگا کہ تم فخر ملک بنجاؤگے اور تم کو معاش کی فکر نہوگی۔

حکیم خدا حکیم

ولا تلقوا بایدیکم الی التہلکۃ

اپنے ہاتھوں سے اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو فی الحقیقت دانتوں کے امراض خصوصاً پایوریہ جس میں پیپ آتی ہے صدہا بیماریاں مثلاً ضعف معدہ بدہضمی درد سر و درد گردہ و درد جگر اختلاج قلب اور اکثر مستورات کی بیماریاں مثلاً امساک حمل بے وقت اسقاط حمل اختناق الرحم (ہسٹریا) دورہ وبعض جلدی امراض پیدا ہو کر اکثر مریض قبل از وقت اصلی دانتوں کو ضائع کرنے کے علاوہ قصار ملتی سے ہلاکت کو پہونچتے ہیں یہ مرض ہر مقام پر بلا قید عمر (۹۵) فیصدی اشخاص کو ہوتا ہے اس مرض کا امتحان و علاج کامل خاص ڈنٹل سرجن کے ناممکن ہے ہمارے کارخانہ دندانسازی کے جملہ کام روبرو ہوتے ہیں اور اصلی دانتوں پر سونے کے کراؤن ٹوپی اور سونے کے (بریج) پل سوراخ دندان چاندی یا سونے سے بندکر دینا وغیرہ اہل امریکہ کی صناعی اصول سے مناسب فیس وقت مقررہ پر اطمینان بخش گیارنٹی کے ساتھ انجام دئے جاتے ہیں۔ مستورات کیلئے لیڈی اسسٹنٹ مقرر ہے غربا کیلئے خاص رعایت کیجاتی ہے مشورہ تمام کیلئے مفت کیا جاتا ہے مخفی نہ رہے کہ یہ کارخانہ ملکی و قدیم ہونیکے علاوہ حسب بالا کام ولایتی طریقہ پر مناسب فیس و اطمینان بخش گیارنٹی کے ساتھ کیا جاتا ہے ایسی صورت میں پبلک کو چاہئے کہ جدید و ناتجربہ کار غیر ملکی کارخانوں میں کام لیکر اپنا جانی و مالی نقصان کر کے ولا تلقوا بایدیکم الی التہلکۃ کی مصداق نہ بنے۔ نوٹ تحریری مشورہ کیلئے ٹکٹ آنا چاہئے۔

خیر خواہ ملک

ڈاکٹر سید ابراہیم دندانساز شاہی امریکن ڈنٹل سرجن متصل عابد شاپ حیدرآباد دکن وقت ملاقات صبح ۸ تا شام ۵ بجے تک

عالیجناب حکیم شفاء حسب سے جملہ امراض کہنہ یا قوت کے متعلق مشورہ دیں و ملاقات کریں اوقات مطب صبح ۷ تا ۱۱ منیجر دار الصحت مخزن الشفا کبوتر خانہ قدیم حیدرآباد دکن

دلفریب

یہ کیوں فریب میں لاتا ہے اس وجہ سے کہ دلفریب صابن نباتاتی روغنیات اور بہترین خوشبو سے کیمیائی اصول پر تیار کیا گیا ہے۔ اسمیں کسی قسم کی چربی و نقصان دہ اشیاء شریک نہیں ہیں محکمہ دار التجربہ صنعتی سرکار عالی نے ذریعہ مراسلہ مورخہ ۲۰ نومبر ۱۹۲۹ء بعد تجربہ و امتحان اس صابن کو فائدہ بخش اور بلا ضرر ثابت کیا اور سارٹیفکٹ عطا فرمایا۔

دلفریب صابن کیل چھائیاں اور جلدی امراض کو دفع کر کے چہرہ کو گلاب کے پھول کی طرح خوبصورت اور پر رونق بناتا ہے آپ بھی آزمائیے اور اس ملکی ایجاد کی حوصلہ افزائی فرمائیے ہر بڑی دوکان سے دستیاب ہو سکتا ہے قیمت فی ڈبہ ایک روپیہ دلفریب پومیڈی بوتل ۸/ ؎

المشتہر

دلفریب کمپنی حیدرآباد دکن

آپکی ضرورت

ہر شئے بلدہ اور اضلاع میں بہت آسانی کے ساتھ پہنچاتے ہیں ہر قسم کے کپڑے اور دیگر ضروریات کا سامان ہم سے خریدیے تجارت پیشہ اشخاص کے ساتھ خاص رعایت ہے

جے اے کریم

جنرل مرچنٹس جیمس اسٹریٹ سکندرآباد

لطف زندگی

اگر آپ کو پان کا شوق ہے اور اس کا لطف اٹھانا چاہتے ہیں تو آپ خوشبودار مفرح اور مقوی دل و دماغ قوام گتھہ عنبری و قوام زرد مشکی رجسٹر شدہ کو استعمال کیجئے۔ ہر دو کی قیمت ارزاں ہے شیشی کلاں صرف ۸ر اوسط ۴ر خورد ۲ر ایکمرتبہ آپ اس کو پان میں لگا کر کھائیے تو معلوم ہو جائے گا۔ کہ حقیقت میں یہ کیا چیز ہے اور اس میں کیا مزہ ہے اضلاع کے بیوپاریوں کو مناسب کمیشن دیجائیگی۔ درخواست پر قواعد کا مطبوعہ فارم روانہ کیا جائے گا۔ بیشمار سرٹیفکیٹ و تعریفی خطوط موجود ہیں۔ امیر و غریب ڈاکٹر حکیم سبھوں نے اس کو پسند کیا ہے۔ باوجود انتہائی خوشبو کے دافع زکام و نزلہ ہے **نوٹ** اضلاع کے احباب طلب فرماتے وقت ۴ر کے ٹکٹ برائے خرچ پارسل ضرور بھجوا دیں۔

مزید سہولت

معمولی ہو یا مہلک ہر مرض کی آپ کیفیت لکھکر ادویات منگا سکتے ہیں بیرونی احباب کی بار بار کی خواہشات اور انکی رفع مشکلات کے مدنظر شفاخانہ میں یہ انتظام کیا گیا ہے کہ خط وصول ہونے ہی فی الفور اسی وقت ادویات مطلوبہ تیار کر کے ذریعہ پارسل روانہ کر دئیے جاتے ہیں جب سے کہ شفاخانہ میں یہ انتظام کیا گیا ہے اضلاع کے احباب عام ادویات مثلاً بخار کھانسی اور دیگر عوارضات کے اپنے و نیز مستورات و بچوں کے لئے بھی کیفیت لکھکر فی الفور طلب کر لیا کرتے ہیں۔ چونکہ اکثر دیہات میں لائق طبیب نہیں اور نہ عمدہ ادویات میسر آسکتی ہیں اس لئے حضرت حکیم صاحب نے ملازمین میں مزید اضافہ کر کے یہ انتظام کیا ہے۔ ورنہ پہلے صرف مزمن اور خاص امراض کے لئے باہر ادویات روانہ کئے جاتے تھے چونکہ اب مستقل طور پر جدید عملہ قائم کیا گیا ہے پس اضلاع کے احباب ضرور فائدہ اٹھائیں اور معمولی سے لیکر بڑے امراض تک کی مفصل کیفیت لکھکر بلا تامل روانہ کر دیا کریں البتہ حالات کے لحاظ سے مریض کو دیکھنے کی شدید ضرورت سمجھی جائے تو حضرت حکیم صاحب ایما فرمائینگے ورنہ ضروری ادویات بذریعہ پارسل فوراً روانہ کر دیے جائینگے۔ **نوٹ** احباب ادویات طلب فرماتے وقت ۴ر کے ٹکٹ لفافہ میں بند کر کے ضرور بھجوا دیا کریں تا روانگی ادویہ کے وقت ٹکٹ پارسل پر لگا دئیے جا سکیں اور بغیر ٹکٹ وصول ہوئے پارسل روانہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے پہلے ہی ٹکٹ روانہ فرما دیا کیجئے۔ تاکہ فی الفور تعمیل ہو سکے۔

موجودہ زمانہ کی سب سے بہترین مقوی دوا۔

حب اکسیر الدین یعنی جسمانی طاقت کی گولیاں۔ جس کا استعمال قوت باہ و تقویت اعضا رئیسہ کے لئے جادو کا اثر دکھاتی ہے جس کے دو تین ہفتہ کا استعمال کھوئی ہوئی قوت اور گئی ہوئی طاقت کو واپس و بحال کرنے کے لئے لاجواب و بےمثل ہے اور جو لوگ کمزوری کے باعث اپنی زندگی سے بیزار ہو گئے تھے۔ وہ ان گولیوں کے استعمال سے بفضل خدا صاحب اولاد ہو گئے ہیں قیمت (۶۰) گولیوں کی پانچ روپیہ (۳۰) گولیوں کی دو روپیہ آٹھ آنہ (۳۰) گولیوں سے کم نہیں دیے جائینگے۔ اضلاع کے احباب چار آنہ کے ٹکٹ روانہ فرما کر طلب فرما سکتے ہیں

ملنے کا پتہ — نیر شفاخانہ سعادت منزل متعلقہ عالیجناب مولوی حکیم سید ... معالج امراض کہنہ شاہ علی بنڈہ چوک سپاہان ... حیدرآباد دکن ٹیلیفون نمبر ۱۶۸

دکن کا علمی مرکز

قلمرو آصفیہ کا عظیم الشان کتب خانہ **مکتبۂ ابراہیمیہ** جو انجمن ہائے امداد باہمی سرکار عالی کے تحت ابنائے ملک کے مشترکہ سرمایہ سے اہل ملک کی علمی خدمت اور مالی منفعت کے لئے قائم ہے **مکتبہ میں** اہل ذوق کی سہولت کیلئے ہر مذاق کی کتابیں مہیا کی گئی ہیں۔ مکتبہ میں اردو زبان کے علم و فن کی جملہ کتابیں، انگریزی ادب کی مشہور اور موقتی سیاسی کتابیں، **درسی** کتابیں مروجہ مدارس ممالک محروسہ سرکار عالی و آلات تعلیمی ۔ نیز، عربی، فارسی کی قدیم و جدید کتابوں کا بڑا ذخیرہ ہے۔ مکتبہ خود علمی اور تعلیمی کتابیں شائع کرتا ہے جن پر بلند پایہ رسالوں، موقر اخباروں اور فاضل نا قدوں نے قدر افزا تنقیدیں کی ہیں۔ مکتبہ میں مشہور ادبی رسالوں کی **ایجنسی** بھی ہے۔

مکتبہ کا علمی کارنامہ

دکن میں اردو ۔ اردوئے قدیم کی ابتدائی تاریخ اور دکنی شعرا کا مستند تذکرہ قیمت عہ

روح تنقید ۔ فن تنقید پر قدیم اور جدید روشنی میں پہلی کتاب عہ

تنقیدی مقالات ۔ تنقیدی اصولوں کا عملی استعمال ۱۲؍

اردو کے اسالیب بیان ۔ اردو نثر کی تاریخ اور مشہور نثر نگاروں کے طرز تحریر پر تبصرہ عہ

دنیائے افسانہ ۔ اردو افسانہ نویسی کی تاریخ اور اس کے اصول پر پہلی کتاب ہر

ارباب نثر اردو ۔ نثر کی ابتدائی تاریخ اور اس کی ارتقاء پر تحقیقی مقالے عہ

خیابان اردو ۔ قدیم و جدید مشہور ادیب اور شاعروں کے نظم و نثر کا بے نظیر انتخاب عہ

سلطان محمود ۔ غزنوی کی بزم ادب! سلطان محمود کے علمی کارناموں کا مرقع ۱۲؍

مبادی فلسفہ ۔ فلسفہ اور اس کے مختلف اصناف پر پہلی کتاب قیمت ۱۲؍

آثار الکرام ۔ سلاطین غزنوی کے علمی کارناموں کی مستند تاریخ ۱۲؍

اسوۂ حسنہ ۔ سیرۃ آنحضرت کی مختصر لیکن جامع تاریخ ۸؍

جواہر کلیات نظیر ۔ اردو کے ابتدائی نیچرل شاعر کے کلام کا بہترین انتخاب ہر

اعظم اللغات ۔ قانونی اور دفتری اصطلاحات کا مستند لغات سے

شاہ رفیع الدین قندہاری ۔ دکن کے ایک مشہور صاحب سلسلہ صوفی کا تذکرہ ۵؍

خزینہ اخلاق ۔ اخلاقی نظم و نثر کا قابل قدر مجموعہ ۶؍

دکنی لغات ۔ قدیم اردو الفاظ و محاورات کی کلید ۸؍

مکتبہ کا علمی شغل

مجلۂ مکتبہ ۔ دکن کا بہترین کثیر الاشاعت علمی، ادبی اور معیاری رسالہ۔ علم و ادب کے تحقیقی مقالوں، اردو قدیم یعنی **دکنیات** پر تدقیقی مضامین، طبعزاد اور مترجم اصلی افسانوں، بلند پایہ نظموں اور مشاہیر کی کمیاب **تصویروں** اور تازہ و جدید مطبوعات کی اطلاعات کے ساتھ مولوی عبد القادر سروری ایم۔ اے۔ ایل ایل بی۔ کی زیر ادارت ماہانہ شائع ہوتا ہے۔ چندہ سالانہ (للعہ، ششماہی ۲عہ)

تجارت پیشہ حضرات

مجلۂ مکتبہ میں اشتہار دیکر اپنی تجارت کو کئی گنا زیادہ فروغ دے سکتے ہیں۔ چونکہ اس کے مطالعہ کرنیوالے حضرات کا حلقہ نہایت وسیع اور ہر مذاق اور طبیعت رکھنے والوں پر مشتمل ہے۔ نرخنامہ فوراً طلب کیجئے

پتہ: مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی (محدود) اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

کارکیا

شیشی میں بند ہوں میں کیا پوچھتے ہو کیا ہوں
کھل جائے منہ جو میرا ہر مرض کی دوا ہوں

معزز حضرات ! یہ وہ دوا ہے جس سے ہر مرض انشاءاللہ تعالیٰ باسانی تمام بلا مشورہ طبیب و ڈاکٹر ہدایت ملفوفہ پر عمل پیرا ہونے سے دفع ہوسکتا ہے علاوہ ان متعدد سرٹیفکٹوں کے جو حاذق حکیم اور تجربہ کار ڈاکٹروں نے وقتاً فوقتاً عطا کی اس کا سرٹیفکٹ منظوم دافع اور تیر بہدف دوا کے متعلق جس کو ایک صاحب نے صدق دل سے عطا فرمایا ہے قدردان پبلک کے ملاحظہ کے لئے بجنسہ طبع کیا جاتا ہے۔

سارٹیفکٹ

ہر مرض کی دوا ہے کارکیا کہ — بڑا عالم کا اس نے پار کیا
جب اطبا نے دیدیا تھا جواب — جب کیا کارا اپنا کار کیا
حکمت لقمان و ارسطو کو — اس مسیحا نے پھر ابھار کیا
دیکھی اس کی خضر نے جب تاثیر — آب حیواں کو بھی نثار کیا
سیکڑوں مرض لا شفا کو یہ — دور کر ڈالا جب کہ وار کیا
گھر میں موجود تھا کارکیا — کیوں مسیحا کا انتظار کیا
جب معطل ہوا اعتدال مزاج — کیجئے استعمال کارکیا

غرض دریہ دوا اپنا مسیحائی اثر تمام امراض پر روز پیرایہ میں دکھلاتی ہے۔ ملنے کا پتہ
سید یعقوب علی سول ایجنٹ گولی گوڑہ حیدرآباد دکن

مقنن و ہفتہ وار رسالہ

ہے جو ہر ہفتہ میں شایع ہوتا ہے جس نے ایک ماہ میں ۱۲۵ نظائر دیے ہیں ؛

حصہ اول : مضامین وتراجم
حصہ دوم : نظائر دیوانی و فوجداری جوڈیشل عثمانیہ عدالت العالیہ
حصہ سوم : نظائر دیوانی و فوجداری عدالت ہائے عالیہ ضمیمہ نظائر مال وعطیات احکام گشتیات وقوانین اٹل نہایت خوبصورت کاغذ عمدہ طباعت وکتابت دیدہ زیب قیمت بالاقساط ششماہی ہے محصول ڈاک سالانہ للعہ ششماہی [illegible]

مقنن نامپلی حیدرآباد دکن

تین خوراک میں حکمیہ فائدہ

کہنہ جریان اور سرعت کیلئے مفید اور مؤثر دوا سفوف مرکب (۱۲) خوراک عیہ

المشتہر حنفی دواخانہ "حکیم شفا" حیدرآباد دکن کبوتر خانہ قدیم

اخبار صبح دکن دیکھنے کے بعد اسکو ضرور دیکھو

تسلیم۔ حال میں ایک واقعہ زندہ طلسمات سے میرے روبرو وقوع پذیر ہوا ہے جس کا اظہار ذیل میں کیا جاتا ہے۔ میں موضع دیلال تعلقہ ٹین جرد ضلع میدک کو اپنی ضرورت پر گیا ہوا تھا۔ زندہ طلسمات کی عام شہرت اور تعریف سنکر سفر میں ایک شیشی ساتھ رکھا تھا۔ موضع مذکور میں ایک شخص جو قدیم ڈھنگر سے تھا۔ اس کو بچھونے کاٹا اس کی حالت اسقدر ردی ہوگئی تھی کہ اس کے منہ سے کف جاری ہوگیا تھا۔ اور بیہوشی طاری تھی۔ مجمع میں ایک شخص نے کہا کہ کاش اس وقت زندہ طلسمات ہوتا تو کیا خوب تھا۔ میں نے کہا کہ میرے پاس موجود ہے۔ مگر ایسی حالت میں کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ اس نے کہا آپ عنایت تو کیجئے۔ میں نے شیشی حوالہ کیا۔ اس شخص نامعلوم نے فوراً جس حصہ میں بچھو کاٹا تھا۔ اس کے دوسرے طرف کی آنکھ میں دو قطرہ زندہ طلسمات کے ٹپکا دیا۔ دو منٹ کے بعد ایک عجیب کرشمہ ہوا۔ وہ یہ کہ بیہوشی دور ہوئی اٹھ کے بیٹھ گیا۔ اس کے قریب المرگ ہونے کی حالت مبدل بہ صحت ہوگئی۔ خدا کا شکر ہے کہ آپکی ایجاد کردہ ملکی دوا بندگان خدا کو فائدہ دیتی ہے۔ محبوب احمد مددگار محافظ دفتر معتمدی تعمیرات

مہتمم کارخانہ زندہ طلسمات اطلاع دینے والے صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اور یہ کہتے ہیں کہ بچھو کاٹے مقام پر ہم نے لکھا ہے بجائے اس کے دل کی آنکھ میں ڈالی گئی اور مریض اٹھ بیٹھا اسی لئے ہم اپنے اشتہار پہ لکھتے ہیں۔ فضل رحمن ہو تو کیا ڈر ہو رب نگہبان ہو تو کیا ڈر ہے

الله شافی

جناب حکیم سید عبد اللہ صاحب رہبر کی تیار کردہ

معجون رفیق صحت

جسکو جناب حکیم صاحب قبلہ نے خاص طلبا، اور دفتری کاروبار کرنے والے اصحاب کے حفظ قوائے دماغی کے لئے ترتیب دیا ہے۔ نو سال کی عمر والا طالب علم اور ایک ضعیف سے ضعیف شخص بھی اس کو بے کھٹکے استعمال کر سکتا ہے۔ مردوں کے عوارض جریان وغیرہ اور ایسے ہی عورتوں کے عوارض کے لئے خصوصیت سے مفید ہے۔ مرض نسیان اور مقوی دماغ ہے۔ حافظہ کو خوب تیز کرتی ہے۔ گردوں اور جگر کو قوت بخشتی اور شحم کا اضافہ کرتی ہے۔ رقیق مادوں کو اعتدال پر لانا دل کو فرحت بخشنا۔ رنگ کو نکھارنا۔ احتیاج کے موافق جسم میں خون پیدا کرنا اس کا مخصوص فعل ہے۔ تھوڑی سی محنت یا مطالعہ کی کثرت یا دفتری کاروبار کے انہماک کی وجہ جو طبائع پست اور دماغ شست ہو جاتے ہیں۔ ان کے لئے نعمت غیر مترقبہ ہے۔ نوجوان طلبا! کے افادہ کو مدنظر رکھکر جناب حکیم صاحب قبلہ نے ان امراض مخصوصہ کے بدرقے علیحدہ تجویز کئے ہیں تاکہ مختلف مزاجوں کے کام اچھی طرح آسکے۔ ہر اس حاجتمند شخص کو جو کسی خاص مقصد کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہو بذریعہ خط یا بالمشافہ جناب حکیم صاحب قبلہ سے مشورہ لینا چاہئے۔ یہ ہماری ملکی جڑی بوٹیوں کا ایک نہایت لذیذ و خوش ذائقہ بہترین مرکب ہے۔ افادہ عام کی غرض سے اسکی قیمت بھی بہت کم رکھی گئی ہے یعنی فی روپیہ دس تولہ، مقدار خوراک ۶ ماشہ صبح و ۶ ماشہ شام ہمراہ شیر وغیرہ بدرقہ

حکیم سید ابراہیم منتظم دواخانہ رہبر صحت چنچل گوڑہ حیدرآباد دکن